بیادگار: محبوب العلماء والصلحاء
حضرت اقدس مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی قدس سرہ

قرآن وسنّت اور روایاتِ اسلافِ اُمّت کے آئینہ میں
راہِ تصوّف وسلوک کا قلمی ترجمان!

ماہنامہ

فیضانِ نقشبند

مُدیر

مفتی احمد اللہ غوری نقشبندی مجدّدی

خانقاہ نقشبندیہ مجدّدیہ اورنگ آباد

www.ilmozikr.com

نسبت اور معیت الٰہی کا استحضار

محبوب العلماء والصلحاء
حضرت اقدس مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی قدس سرہ

صاحب نسبت حضرات کا ایک وصف یہ بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت کا استحضار نصیب ہو جاتا ہے؛ یعنی وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کو اس طرح اپنے ساتھ پاتے ہیں کہ گویا وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں وَھُوَمَعَکُمۡ اَیۡنَمَا کُنۡتُمۡ (تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے)۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پاک ارشاد ہے: أَنۡ تَعۡبُدَاللّٰہ کَأَنَّکَ تَرَاہُ، فَإِنۡ لَّمۡ تَکُنۡ تَرَاہُ فَإِنَّہٗ یَرَاکَ (اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر یہ کیفیت نہ ہو تو پھر خیال کرو کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے) لہٰذا اللہ والے اپنے آپ کو ہر لمحہ اللہ جل شانہ کے حضور میں پاتے ہیں اور ان کی معیت اختیار کر کے ہر وقت مؤدب رہتے ہیں۔ (اقتباس از: رہے سلامت تمہاری نسبت: ص ۸۰)

اہم وضاحت

’’ماہنامہ فیضان نقشبند کے تمام مضامین دراصل حضرت مدیر محترم مدظلہ کے مختلف بیانات اور دروس کی تحریری ترتیب ہے۔‘‘ (ادارہ)

فہرست مضامین

قندیل ربانی (درسِ قرآن عظیم الشان)	پاکیزہ غذا اور عمل صالح کا تعلق	ضبط وترتیب مفتی محمد عبدالمتین قاسمی	۳
نورِ نبوت (درسِ حدیث پاک)	نیت کی درستی؛ عبادت کا جوہر اور بنیاد کا پتھر	ضبط وترتیب مفتی عبدالرافع قاسمی	۶
سخن اوّلیں	حضرت جی قدس سرہ کی حیاتِ طیّبہ کے تین مرکزی روشن پہلو	مدیر محترم	۱۱
درسِ عقائد	عقائد کی تعلیم، ضرورت واہمیت	ضبط وترتیب مفتی سیف اللہ قاسمی صاحب	۳۳
اکابر شناسی	چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا	ابوسیّد محمد اللہ غوری	۳۶
تعارفِ کتبِ تصوف	تصوف وسلوک	ضبط وترتیب: مفتی محمد عمران کورٹلوی	۴۱
خطوط ہائے راہِ معرفت	درسِ قصد السبیل	مفتی احمد اللہ غوری نقشبندی مجدّدی	۴۶
سلوک کی ڈاک	ہدایۃ السالکین	ضبط وترتیب: محمد عمران کورٹلوی	۵۴
اصلاحی وتربیتی منظوم کلام	پیامِ محبّت	سید منصور غوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۵۸

قندیل ربّانی

(درسِ قرآن عظیم الشان)

پاکیزہ غذا اور عملِ صالح کا تعلق

ضبط وترتیب: مفتی محمد عبدالمتین قاسمی (وجے واڑہ)

ارشادِ ربانی ہے: فَابْعَثُوْا أَحَدَكُم بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا (سورة الکهف:۱۹)

ترجمہ: (اصحابِ کہف جب اپنی تین سو سالہ طویل نیند سے بیدار ہوئے اور انہیں بھوک محسوس ہوئی) تو انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو کچھ رقم دے کر شہر کو یہ کہتے ہوئے بھیجا کہ جاؤ! ہمارے لیے کھانا لے آؤ اور کھانا بھی وہ لے آنا جو سب سے زیادہ پاکیزہ، سب سے زیادہ ستھرا ہو! پھر تمہارے پاس وہاں سے کچھ کھانے کو لے آئے، اور اسے چاہیے کہ ہوشیاری سے کام کرے، اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔

اللہ رب العزت نے جہاں اصحابِ کہف کو کفر کی گندگی سے اور ظالم بادشاہ کے ظلم سے بچایا، وہیں ایمان کی حفاظت اور اس میں ترقی کے لیے ان کے دل میں یہ بات بھی ڈال دی کہ پاکیزہ غذا کھانا اور اس کی تلاش کرنا اللہ کے نیک بندوں کی شان اور ان کی امتیازی خصوصیت ہے؛ بلکہ راہِ ولایت کی ہر منزل اکلِ حلال پر موقوف ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ انسان کی روحانی زندگی کی نشو ونما اور اس کی تر وتازگی کا تعلق اس کی عبادات اور ذکر واذکار سے ہے، یہ بات یقیناً درست ہے، اس سے انکار بھی نہیں ہے؛ لیکن قلب وروح کی ترقی کا اصلی آغاز اور سرچشمہ وہ نوالہ ہے جسے انسان اپنے پیٹ میں اتارتا ہے، وہ کمائی ہے جس کو انسان اپنے ہاتھوں سے کماتا ہے اور وہ روزی ہے جس کو انسان اپنے گھر میں خرچ کرتا ہے، یہ تمام چیزیں

استاذ ابو ہریرہ اکیڈمی (آن لائن)، اورنگ آباد

اس کی روح وقلب کی حقیقی ترقی کے لئے نقطہ آغاز ہے۔ کیوں کہ بارگاہِ خداوندی میں روح کی ترقی اور دل کی اصلاح اعمالِ صالحہ کی قبولیت پر ہی موقوف ہے اور اعمالِ صالحہ کی قبولیت، رزق کی پاکیزگی پر موقوف ہے، جس کے بغیر اس راہ پر چلنے کی ابتدا ہی مشکل ہے۔

پاکیزہ غذا کا عملِ صالح کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے، جب بندہ حلال غذا کا اہتمام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں نیکی کی نئی نئی شکلیں القاء کرتے ہیں۔ پیغمبروں سے خداوندی کلام یہی ہوا ہے کہ ”پاکیزہ غذا کھاؤ اور عملِ صالح میں لگے رہو!“ یٰاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا۔ جب غذا میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو جسم سے پہلے روح متأثر ہوتی ہے اور اعمال مردود ہوتے جاتے ہیں۔

حدیث پاک میں وارد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اپنے کھانے کو پاک کرو!“ اللہ کی قسم! جب کوئی شخص حرام کا لقمہ پیٹ میں ڈالتا ہے تو چالیس دن تک اللہ تعالیٰ اُس کا عمل قبول نہیں کرتے، جس شخص کا بدن حرام مال سے بڑھا تو اُس کا بدلہ سوائے جہنم کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ (المعجم الاوسط للطبرانی: ص: ٦٤٩٥)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دو امور کا بڑا دھیان رہا کرتا تھا: ایک صدقِ مقال (سچ بولنا) اور دوسرے اکلِ حلال (حلال روزی)! پاکیزہ غذا کا اہتمام اب ہماری زندگیوں سے مفقود ہوتا جا رہا ہے، حرام غذا کا نام آئے گا تو کہیں گے کہ ہاں! فلاں چیز حرام ہے، شراب کا نام آئے گا تو کہیں گے کہ ہاں! پینا حرام ہے، اس سے زیادہ کا علم ہی نہیں ہے، اور کون کون سی چیزیں حرام ہیں؟ کون کون سی چیزیں مکروہ تحریمی ہیں؟ مزید کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں ویسے بھی نہیں کھانا چاہیے باوجود یہ کہ وہ حلال ہیں؟ اب اس بات کی فکر ہی نہیں رہی کہ حلال میں کیا کھانا ہے اور کیا نہیں؟ حالاں کہ اس بات کا اہتمام ہونا چاہئے! پانی پیتے ہوئے سوچیں کہ پانی تو بیشک ایسی چیز ہے کہ اس میں حلال حرام کی کوئی بات نہیں ہے؛ لیکن یہ سوچیں کہ مجھے پانی پلانے والا جہاں سے پانی لا رہا ہے کہیں سامنے والے پر ظلم کر کے تو نہیں لا رہا ہے؟ اگر ظلم کر کے لایا ہے تو وہ پانی پینا میرے لیے جائز ہوگا؟

انسانی اخلاق پر سب سے زیادہ اثر اس کی غذا اور اس کی صحبت کا ہوتا ہے۔ مختلف غذاؤں کے اثرات مختلف ہوتے ہیں، بازاروں کی چیزوں، مشتبہ اور حرام غذاؤں کے اثرات ویسے ہی اخلاقِ

رذیلہ کی صورت میں رونما ہوتے ہیں۔

ہمارے حضرت جی قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ ’’اپنے پیٹ کو کچرے کا ڈبہ نہ بناؤ کہ کچرا اٹھایا اوراس میں پھینک دیا، ڈمپ کردیا، پیٹ کچرے دان نہیں ہے کہ یوں نوالہ لیا اور منہ میں ڈال لیا۔ پہلے یہ سوچنا ہے کہ یہ لقمہ کہاں سے آیا؟ کیسے آیا؟ لانے والا کون ہے؟ دینے والا کون ہے؟ تو پتہ چلے گا کہ اب یہ کھانا ہے یا نہیں کھانا؟ اس کے بعد کھانے والی چیزیں بہت کم ہوجائیں گی، نہیں کھانے والی چیزیں زیادہ ہوجائیں گی۔‘‘

یہ بات بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر حلال چیز کھائی جائے، بازاروں کے کھانے پینے سے احتیاط بڑی ضروری ہے، بازاروں سے من چاہی چیزیں خرید کر کھانے والا ولایت کے اعلیٰ درجے تک نہیں پہنچ سکتا ہے، جہاں پہنچ کر اسے واقعی اللہ کے مزے آئیں! جو بازاروں کے کھانے کھائیں گے، خواہ وہ چالیس چالیس دنوں سے تکبیرِ اولیٰ کا اہتمام کررہے ہوں گے، کئی کئی سالوں سے ان کی تہجد قضا نہیں ہوئی ہوگی، کبھی وہ بدنگاہی کا ارادہ ہی نہیں کیے ہوں گے؛ لیکن وہ بازاروں کا کھانا کھانے کے بعد بدنگاہی میں مبتلا ہوجائیں گے، مؤمن کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ ہر جگہ کی اور ہر گری پڑی چیز کھالے۔

آج کے دور میں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کھانے پینے کی پاکیزگی کا بڑا اہتمام ہو کہ ہر چیز پیٹ میں نہ جائے! صرف پاکیزہ چیز جائے، مشتبہ چیزیں ہرگز نہ جائیں!

جو مومن حلال کھانے کی فکر کرے گا (ان شاء اللہ) تعلق مع اللہ کی دولت اسے نصیب ہوگی اور درحقیقت بات یہ ہے کہ جس کو تعلق مع اللہ نصیب ہوجاتا ہے پھر وہ بتایا نہیں جاسکتا، وہ صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، اس کو دنیا میں رہتے ہوئے جنت کے مزے آتے ہیں۔ اللہ پاک ہمیں اکلِ حلال اور صدقِ مقال کی دولت سے مالا مال فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

نور نبوت

(درسِ حدیث شریف)

نیت کی درستی؛ عبادت کا جوہر اور بنیاد کا پتھر

ضبط وترتیب: مفتی سیّد عبدالرافع قاسمی

عَنْ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ أَبِي حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ ۔(رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ)

ترجمہ: ’’امیر المؤمنین، ابوحفص، حضرت عمر بن خطاب ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ’’بے شک اعمال کا تعلق نیتوں سے ہے‘‘۔ اور ہر انسان کو وہی ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لیے ہو، اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ہی کی طرف شمار ہوگی؛ اور جس کی ہجرت کسی دنیوی فائدے کے حصول یا کسی عورت سے نکاح کے ارادے سے ہو، تو اس کی ہجرت اسی مقصد کی طرف سمجھی جائے گی، جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔‘‘ (متفق علیہ)

مذکورہ بالا حدیث کا بنیادی مضمون ’’اخلاص نیت‘‘ ہے۔ چناں چہ اس حدیث کو حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کی پہلی حدیث بنایا ہے اور ان کی اتباع میں دیگر محدثین نے بھی اسی سے آغاز کیا ہے۔

لفظ ’’اخلاص‘‘ کی تحقیق:

’’اخلاص‘‘ کا مطلب ہے اصل چیز کو دوسری غیر متعلقہ چیزوں سے الگ کر دینا۔ مثال کے

استاذ ابو ہریرہ اکیڈمی اورنگ آباد

طور پر مٹھائی کے ٹکڑے پر کوئی چیز کنکر وغیرہ لگ جائے یا ایسی کوئی چیز لگ جائے جس کا مٹھائی سے تعلق نہیں ہے تو انسان اس کو صاف کر دیتا ہے اور خالص مٹھائی کو اپنے لیے پسند کرتا ہے، بس یہی مثال اخلاص کی ہے۔ عبادات ہوں کہ دیگر اعمال، ہر غیر متعلق چیز کو ان سے ہٹا کر صرف اللہ کے لئے خالص کر دینا، یہی اخلاص ہے۔

''اخلاص نیت'' راہ سلوک میں بنیاد کا پتھر:

اخلاصِ نیت (نیت کی درستی) راہِ سلوک میں بنیاد کا پتھر ہے۔ لہٰذا اگر اللہ کے سوا کوئی اور چیز مقصود ہوگی یا اللہ کے ساتھ کوئی اور شئی بھی مطلوب ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ غیر اللہ میں لگا ہوا ہے۔ ابھی اللہ تک نہیں پہنچا۔ جب اللہ تک نہیں پہنچا تو پھر وہ صوفی اور سالک کیسا؟ پھر اس کو اللہ والا، عارف اور عاشق کیسے کہیں گے؟

حسن نیت اور اس کا استحضار:

ہماری زندگی میں جتنے اچھے کام ہیں، چاہے ان کا تعلق دنیا سے ہو یا دین سے، ان تمام کاموں میں ''حسن نیت'' مطلوب ہے اور پھر اس کا اس قدر استحضار ہونا چاہیے کہ گویا وہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہے۔ پھر اقوال واعمال کی طرح ہمارے تمام احوال میں بھی حسن نیت مستحضر ہونا چاہیے۔ اقوال واعمال میں نیت تو بآسانی سمجھ میں آتی ہے کہ کوئی دینی بات کہی یا سنی جا رہی ہے یا کوئی جسمانی یا مالی عبادت (نماز روزہ زکوۃ حج صدقہ وخیرات وغیرہ) انجام دی جا رہی ہے۔ لیکن احوال کس کو کہتے ہیں؟ اور ان میں حسن نیت کے استحضار کا مطلب کیا ہے؟ تو جاننا چاہیے کہ احوال کہتے ہیں انسان کی مختلف حالتوں کو۔ جیسے چلنا پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا، دیکھنا اور سوچنا، اسی طرح خوشی کی حالت، غم کی کیفیت، راحت کے مواقع، مصیبت کا مرحلہ، خوشحالی وتنگدستی کے اوقات، محبت اور غصے کی گھڑیاں، دوستی اور دشمنی کے معاملات وغیرہ۔ ان سب احوال میں حسن نیت مطلوب ہے اور ذہن میں رکھنا چاہیے۔

احوال کی دو قسمیں:

پھر انسان کی حالتیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو ظاہر میں نظر آتی ہے اور ایک وہ جو چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر غصے میں پیشانی پر شکنیں پڑ رہی ہیں، چہرہ سرخ ہو رہا ہے، سر کے

بال کھڑے ہورہے ہیں وغیرہ۔ یہ ظاہری حالت ہے۔ اور کبھی انسان ظاہر میں کچھ ہوتا ہے اور باطن میں کچھ۔ مثلاً: ملاقات کے وقت مسکراتے ہوئے ملتا ہے، لیکن دل میں نفاق بھرا ہوا ہوتا ہے اور دل کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ موقع مل جائے تو انتقام لے لوں۔ پتہ چلا کہ ظاہر میں تو مسکراہٹ کے ساتھ ملاقات ہے لیکن دل میں نیت ٹھیک نہیں ہے، لہٰذا یہ نفاق حالی ہے۔

نفاقِ حالی کی ایک اور مثال:

اسی طرح اگر کوئی فجر میں بیدار ہونے کے لئے اپنے فون میں الارم لگائے لیکن دل میں یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ مجھے اٹھنا ہی نہیں ہے تو یہ بھی نفاق حالی ہے۔ ظاہر اور باطن؛ دونوں میں نیت ایک ہی ہونی چاہیے اور درست نیت ہونی چاہیے۔ لہٰذا انسان کو ہر حال میں جھوٹ اور نفاق سے بچنا چاہیے اور ہر وقت اپنے اللہ کے ساتھ سچائی کا معاملہ رکھنا چاہیے۔ یہیں سے ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ انسان صادِق بھی رہے، صَدُوق بھی رہے اور صِدّیق بھی رہے۔

صَادِقْ، صَدُوْقْ اور صِدِّیْقْ کے معنی اور ان میں باہمی فرقِ مراتب:

صادق اس شخص کو کہتے ہیں جو گفتگو میں سچا ہو ''صادق فی الأقوال'' اور "الصدوق" سے مراد ایسا انسان ہے جو گفتگو میں بھی سچا ہو اور عمل میں بھی سچا ہو ''الصادق فی الأقوال و الأعمال''۔ اور ان دونوں سے آگے ہے ''اَلصِدّیق'' جو گفتگو میں بھی سچا ہو، عمل میں بھی سچا ہو اور حالت میں بھی سچا ہو اسی کو عربی میں کہتے ہیں ''الصَّادقُ فی القَولِ و العَملِ و الحالِ''۔ چنانچہ اس امت کے سب سے پہلے صدیق حضرت سیدنا ابو بکر رضی اللہ تعالی عنہ ہیں۔

اعمال کا تعلق نیتوں سے ہے:

چنانچہ مذکورہ بالا حدیث مبارک میں نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ''، یعنی اعمال کا تعلق نیتوں سے ہے۔ اس لیے کہ نیت کے بغیر عمل کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ''اس امت کی بیماری یہ نہیں ہے کہ یہ ''بد نیتی'' میں مبتلا ہے بلکہ اس امت کی بیماری یہ ہے کہ یہ ''بے نیتی'' میں مبتلا ہے''۔ چناں چہ لوگ ثواب کے بڑے بڑے کام کرتے ہیں مگر کچھ نیت ہی نہیں کرتے تو پھر ثواب کیسے ملے

گا؟ پتہ چلا کہ عمل کا وجود بھی اور عمل کی قبولیت بھی، دونوں چیزیں نیت پر موقوف ہیں۔

بے نیتی اور بد نیتی کی مثالیں:

مثلاً کوئی شخص فون پر بات کرتے ہوئے نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد میں داخل ہوا۔ پھر بات مکمل ہوتے ہی فون رکھے اور نماز کی نیت کئے بغیر فوراً اللہ اکبر کہہ کر داخلِ نماز ہو جائے تو نماز درست نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ اس نے نماز کی نیت ہی نہیں کی۔ لہٰذا نہ اس پر ثواب ملے گا اور نہ اس کی نماز مقبول ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص نماز کی نیت تو کرے مگر لوگوں کو دکھانے کے لئے یا شہرت حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھے تب بھی اس کی نماز مقبول نہیں ہوگی۔ کیوں کہ یہ بد نیتی ہے پتہ چلا کہ اعمال کا وجود بھی اور اعمال کی قبولیت بھی؛ دونوں کے دونوں درست نیت پر موقوف ہیں۔

بہ قدر نیت اجر:

آگے نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ''وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوَى ''یعنی ہر شخص کے مقدّر میں اس کی نیت کے حساب سے ہی اللہ نے اجر لکھا ہوا ہے۔ لہٰذا جیسی نیت کی جائے گی ویسا ہی ثواب ملے گا۔ لہٰذا نیت بڑی کرنی چاہیے۔ اگر آدمی صرف دو آدمیوں کو کھانا کھلانے کی نیت کرے تو اللہ تعالی فیصلہ بھی ویسے ہی فرماتے ہیں، لیکن اگر یہ نیت کرے کہ میں روزآنہ کم از کم دس مہمانوں کی ضیافت کروں گا تو اس کی نیت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرمائیں گے، چاہے اس کو ضیافت کا موقع ملے نہ ملے۔

ایک عمل میں متعدد نیتیں بھی کی جاسکتی ہیں:

ایک بات یہ بھی ہے کہ ہم ایک ہی عمل میں کئی نیتیں بھی کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی رشتے دار کے پاس عیادت کے لیے جا رہے ہیں تو عیادت کی نیت کر سکتے ہیں، صلہ رحمی کی نیت بھی کر سکتے ہیں، (وہ اگر غریب و تنگدست ہو تو) محتاج کی خبر گیری کی نیت بھی کر سکتے ہیں۔

نیت میں اگر فساد ہو تو...

آگے نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا

فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ ‘‘اس جملے کا پس منظر تو کچھ اور ہے۔لیکن اس سے ملنے والا بڑا اور اہم نکتہ یہ ہے کہ ہجرت جیسا افضل ترین عمل بھی غلط نیت کی وجہ سے ضائع ہوجاتا ہے۔اسی ضمن میں سالکین کرام کو بھی خود اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ طریقت کی راہ میں چلتے ہوئے مدت ہوگئی لیکن حاصل کچھ نہیں ہوا تو پھر اپنی نیت پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ہوسکتا ہے کہ کوئی نیت ہی نہ کی ہو اب تک، یا پھر ممکن ہے کہ نیت میں فساد ہو۔لہٰذا تنہائی میں بیٹھ کر غور کرنا چاہیے۔کیوں کہ اگر سلوک میں چلتے ہوئے ’’اللہ کو راضی کرنے، انسان بننے، اپنی اصلاح وتربیت کروانے اور اپنے اخلاق درست کرنے کی نیت ہوتی تو اللہ پاک ضرور نواز دیتے۔لیکن اگر سرے سے نیت ہی نہیں ہے یا پھر فسادِ نیت ہے تو پھر انسان کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے ایک مرید کا واقعہ:

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کبار اولیاء کرام میں سے ہیں۔ان کی خدمت میں ایک شخص ۱۸/سال تک رہا۔حضرت اس کی طرف بہت متوجہ ہوتے لیکن پھر بھی دیکھا کہ اس کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہورہا ہے تو حضرت نے اس سے دریافت کیا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟اس سے پوچھا کہ تمہاری نیت کیا ہے؟اس نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے پاس جو دولت ہے وہ مجھے بھی مل جائے بس (یعنی وہ یہ چاہ رہا تھا کہ شیخ کی طرح میں بھی شیخ صاحب بن جاؤں)۔پھر حضرت نے فرمایا کہ اچھا! یہ فسادِ نیت ہی ہے کہ جس کی وجہ سے تجھے اٹھارہ سال صحبت شیخ میں رہنے کے باوجود بھی کچھ نہیں ملا۔چناں چہ مشائخ فرماتے ہیں کہ اگر سالک کی نیت صحیح ہوگی تو اس کو لمحوں میں بھی ولایت کی نعمت مل سکتی ہے۔

خلاصہ:

اس حدیث مبارکہ سے سب سے اہم سبق یہ ملا کہ ہمیشہ اچھی نیت کرنی چاہیے۔سلوک میں چلتے ہوئے بھی صرف اور صرف یہی نیت کرنی چاہیے کہ مجھے اللہ مل جائے اور بس۔اسی کو ہمارے حضرت جی قدس سرہ اکثر ارشاد فرمایا کرتے تھے ’’اللہ بس باقی ہوس‘‘۔چنانچہ جب سالکین اللہ کو پانے کی صحیح اور سچی نیت کریں گے تو پھر اپنی اصلاح وتربیت کروانا بھی آسان ہوگا۔اللہ تعالیٰ ہمیں ہر ہر موقعے پر حسن نیت کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

سخنِ اوّلیں

حضرت جی قدس اللہ سرہٗ واعلی اللہ مراتبہ کی حیات طیّبہ کے تین مرکزی روشن پہلو

از: مدیر

۲۲رفروری ۲۰۲۵ء بروز ہفتہ کوملیشیا میں سالانہ نقشبندی اجتماع کے موقع پر مرشدنا حضرت مفتی سید احمد اللہ غوری صاحب نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کا حاضرین کے درمیان ”محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی قدس اللہ سرہ کے مزاج و مذاق“ کے مرکزی عنوان کے تحت ایک پُرمغز و پُرتاثیر بیان ہوا۔ فضل الٰہی کہ حاضر سامعین کے علاوہ غائبانہ سننے والے احباب کرام کی بڑی تعداد نے اس بیان کو بہت پسند کیا۔ اب وہی بیان حضرت مدیر محترم مدظلہ العالی کی نظر ثانی (اور ضروری حک واضافہ) کے بعد افادۂ مزید کی غرض سے ماہنامہ کے ذریعے تحریری قالب میں پیش خدمت ہے۔ (از: ادارہ)

بیعت درحقیقت اپنے آپ کو کسی کے ہاتھ بیچ دینے کو کہتے ہیں اور بیع (بیچنے اور خریدنے کا معاملہ) اس وقت مکمل ہوتا ہے جب قبضہ تام ہو، قبضہ مکمل نہیں ہوگا تو بیع ناقص رہے گی۔ اس اُصول اور کلیہ کے مدِ نظر ہم میں سے ہر ایک کو خود ہی سوچنا چاہیے کہ ہم نے اپنے شیخ کے ہاتھ میں جو ہاتھ دیا ہے تو کیا قبضہ بھی دیا ہے یا صرف رسم پوری کرنے کی کوشش کی ہے! سو فیصد سپردگی اور مسلوب الارادہ ہونا ہی بیعت کی حقیقت ہے۔

ایک مرتبہ حضرت جی قدس اللہ سرہٗ واعلی اللہ مراتبہٗ نے حاضرین مجلس کو ایک عالم دین کا خط پڑھ کر سنایا اور فرمایا کہ ”سو فیصد سپردگی اس کو کہتے ہیں“ (اُن عالم دین نے کھل کر اپنے تمام احوال خط میں تحریر کیے تھے) جب ایسی کامل سپردگی ہو تو شیخ کی توجہ کے لیے شیخ سے گذارش کرنی نہیں پڑتی،

توجہ خود بخود ہوتی ہے۔

حضرت جی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ’’کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرید اپنے کو ننانوے فیصد شیخ کے حوالے کر دیتا ہے، بس ایک فیصد ہی اٹکن رہ جاتی ہے لیکن حقیقی فائدہ نہیں ہو پاتا اور وہ پریشان ہوتا رہتا ہے کہ میری اصلاح کیوں نہیں ہو رہی ہے؟‘‘ (جب کہ اس کی وجہ وہ خود جانتا ہے کہ سو فیصد سپردگی نہیں ہوئی) اسی لیے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ سے جب بھی کوئی عرض کرتا کہ حضرت! مجھ پر توجہ فرمایے۔ تو حضرت اپنے مخصوص انداز میں فرماتے کہ:

’’پیارے! یہ تمہارا کام ہے؛ میرا نہیں، پھر آگے مزید فرماتے: کہ ’’توجہ تم جتنی کھینچو گے اتنی ملے گی۔‘‘

حضرت جی قدس اللہ سرہ واعلی اللہ مراتبہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ’’سالکین آتے ہیں اور کہتے ہیں: حضرت! ابھی آیا ہوں، آج ہی جانا ہے فلاں سبق چل رہا ہے، مراقبہ تو کچھ نہیں ہو پا رہا ہے، گناہ چھوڑنے کی تو بہت کوشش کرتا ہوں لیکن گناہ نہیں چھوٹتے، توجہ فرما دیجیے۔ بھئی آپ کس چیز کی توجہ چاہتے ہو؟ یعنی خود سے کچھ کرنا دھرنا ہی نہیں اور بس شیخ توجہ کر دے اور کام بنا دے؟‘‘ اصل یہ ہے کہ جب ہم اپنے شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دیں تو اپنے آپ کو بھول جائیں۔ ہمارے سارے مشائخ (ماضی میں جو گذر گئے یا ابھی جو موجود ہیں) کی مشیخت کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وہ کامل مرید تھے۔

بقول حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ: ’’مرید دراصل مسلوب الارادہ ہوتا ہے‘‘ یعنی جس کی چاہت کو شیخ نے سلب کر لیا ہو۔ مرید کو چاہیے کہ شیخ کی خدمت میں عرض کرے کہ آپ میری ہر چاہت و مرضی کو سلب کر لیجیے۔ ہم لوگ چاہتے ہیں کہ حضرت جی سلبی توجہ فرما دیں کہ بغیر ہماری کسی محنت کے سارے گناہ اندر سے ایسے نکل جائیں کہ پھر کبھی نہ ہوں۔ یاد رکھیں کہ حضرت سلبی توجہ بھی اسی وقت فرمائیں گے جب ہم اپنے ارادے کو سلب کرنے کا اختیار حضرت کو دیں گے اور حضرت کی خدمت میں پہنچ کر کہیں گے: ’’أُرِيْدُ أَنْ لَا أُرِيْدُ‘‘ یعنی ’’میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں‘‘۔

اُنہی کا ہی چاہا ہوا چاہتا ہوں:

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ ایک عامی آدمی تھے۔ ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ

ہم بڑی آسانی سے ’’العوام کالانعام‘‘ کہہ دیتے ہیں، کبھی کبھار نیت کبر کی بے شک نہیں ہوتی؛ لیکن الفاظ یقیناً کبر کی بو اپنے اندر لیے ہوئے ہوتے ہیں، ان سے بھی احتراز ایک سالک کا فرض ہے۔ اس اصطلاح کی ترجمانی حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قُدِّسَ سِرُّہٗ نے جہاں جہاں کی ہے وہاں وہاں فرمایا ہے: ’’عوام اہلِ اسلام‘‘ ساری کی ساری عوام کالانعام نہیں ہوتی۔ بہرحال! حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ عامی آدمی تھے؛ لیکن جب ان کے اشعار پڑھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے آپ کو اپنے شیخ کے کس قدر حوالے کیا تھا! جس کا اندازہ خود اُن کے اس شعر سے ہوتا ہے، فرماتے ہیں ؎

میں اپنے ارادے سے کیا چاہتا ہوں
انہی کا ہی چاہا ہوا چاہتا ہوں

ویسے یہ دراصل اللہ پاک کے تعلق سے فرمایا کہ اپنی مرضی سے میرا کوئی چاہنا نہیں ہے، بس جو اللہ چاہتے ہیں وہی میں چاہتا ہوں؛ لیکن یہاں تک پہنچنے کے لیے پہلے انہوں نے شیخ کی چاہت پر اپنی چاہت کو قربان کیا۔ آج کل یہ بیماری بہت عام ہے کہ اپنی رائے اور تجویز کو فنا نہیں کرتے جب کہ بقول حضرت اقدس تھانوی نور اللہ مرقدہٗ ’’راہِ طریقت کا یہ سب سے پہلا قدم ہے۔‘‘

متعدد موقعوں پر حضرت جی قدس اللہ سرہٗ واعلی اللہ مراتبہٗ کے مزاج و مذاق سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ حضرت کی توجہ اسی پر زیادہ ہوتی تھی جو اپنے آپ کو مکمل طور پر حضرت کے تابع کر دے۔ اور طریقت کی راہ میں ہر شیخ اپنے مرید سے یہی چاہتا ہے اور ہر شیخ کو ایسے چاہنا بھی چاہیے۔ اگر وہ اس معاملے میں اپنے مریدین کے ساتھ رُو رِعایت کا معاملہ کرے گا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ مرید کے حق میں خیانت ہو جائے؛ کیوں کہ شیخ کے آگے اپنے کو مکمل فنا کیے بغیر مرید آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

خود رائی ایک مہلک مرض

سلوک کے راستہ میں خود رائی بذاتِ خود ایک مہلک مرض ہے، چاہے وہ اچھی رائے ہو کہ بُری، انسان کا یہ خیال کہ ’’میری یہ رائے ہے‘‘ اس کو فساد تک لے جاتا ہے، وہ اپنی رائے کو کچھ سمجھ رہا ہے اسی لیے پریشان ہے کہ میری رائے کیوں نہیں پوچھی گئی؟ (پھر آگے) مانی کیوں نہیں گئی؟ سلسلہ نقشبندیہ کے ایک بہت بڑے بزرگ شیخ المشائخ حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ

کا شعر ہے۔ ؎

جب تک فنائے رائے کی ہمت نہ پایئے
کیوں آپ اہلِ عشق کی محفل میں آیئے

اور یہ مزاج و مذاق محض اکابر کی بتائی ہوئی بات نہیں ہے؛ حضرات اہلِ علم بخوبی جانتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ”مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ، فَقَدْ أَخْطَأَ“ (سنن ترمذی، کتاب تفسیر قرآن) ترجمہ: جس نے قرآن عظیم الشان میں اپنی رائے چلائی بھلے اُس نے ٹھیک کہا، پھر بھی وہ خطاوار ہے۔

خود رائی مستقل مرض ہے؛ اپنی رائے سے کچھ کہو گے، صحیح بھی کہو گے، پھر بھی تم غلط ہو، لہٰذا بڑوں کے تابع رہو، یہ بات تو قرآن کریم کے تعلق سے ہے۔ دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف کوئی بات منسوب کر رہے ہو تو سوچ لو کہ آگے رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ، رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وغیرہ کوئی معتبر حوالہ کہہ سکتے ہو؟ نہیں تو پھر احتیاط کرو، اس میں بھی یہی اشارہ ہے کہ تابع رہو، مستقل نہ بنو۔

مستقل بالذات نہ بنو

”مستقل بالذات“ ایک اصطلاح ہے، حضرت اقدس حکیم الامت مجدد الملت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس تعلق سے بہت سخت جملہ ارشاد فرمایا ہے کہ ”جو مستقل بالذات ہوتا ہے وہ مستقل بدذات ہوتا ہے“ وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکابر کے پاس یہ امر مسلم ہے کہ جب تک ”میں“ نہیں مٹے گی اس وقت تک کچھ نہیں ہوگا، حضرت جی قُدِّسَ سِرُّہٗ کے ہاں ”عاجز اور فقیر“ جیسے لفظ اسی لیے سکھائے جاتے تھے، کہ لفظ ”میں“ نہ زبان پر آئے اور نہ اپنا اثر دکھائے۔ جب انسان اپنی رائے اور چاہت کو فنا کر دیتا ہے تو پھر شیخ کے سامنے شیخ کی سن کر ماننا اور تابع مطلق ہو کر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔

بیعت کا مقصد

بیعت عام اصطلاح میں مرید ہونے کو کہتے ہیں؛ لیکن اس لفظ کی اگر مکمل تشریح کی جائے تو یوں ہوگی کہ ”اپنے آپ کو کسی بڑے (شیخ کامل) کے ہاتھ میں دے کر اس کے سامنے چھوٹا بن کر زندگی گزارنا۔“ ہم لوگ آدھا کام کرتے ہیں، بے شک بڑوں کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہیں مگر اپنے کو

اُن کی خدمت میں چھوٹا نہیں بناتے۔ پہلے دیکھتے ہیں کہ کون کتنا بڑا ہے؟ ہمارے نزدیک بڑے ہونے کا معیار کچھ اور ہوتا ہے، خواص کے نزدیک بھی اب معیارِ قبولیت ''شہرت'' ہو چکا ہے۔ عوام بے چاری تو جانتی بھی نہیں کہ شہرت کس کو کہتے ہیں اور قبولیت کیا ہوتی ہے؟ ان کو تو دونوں میں فرق سمجھانا پڑتا ہے۔ معیارِ قبولیت، شہرت ہر گز نہیں ہے۔ بہت سارے مشہور غیر مقبول ہوتے ہیں، اور بہت سارے مقبول غیر مشہور ہوتے ہیں، ہمارا معیار یہ ہوتا جا رہا ہے کہ جتنے زیادہ مشہور ہوں گے ان کو اپنا شیخ بنائیں گے تاکہ سارے مشائخ سے بھی کہہ سکیں کہ ہم فلاں سے بیعت ہیں، لہٰذا آپ ہمیں اس اعتبار سے نمبر دیجیے۔ اس میں صاف طور پر نیت کا فساد ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ چاہے جس سے بیعت ہوتا؛ شیخ المشائخ سے، قطب الاقطاب سے، غوث اعظم سے بلکہ خود بھی کیوں نہ بلند مرتبے پر فائز ہو جاتا، خود شیخ اور پیر بھی بن جاتا مگر خود کو اپنے مرید سے بھی کمتر سمجھتا۔

مشائخ تو ایسے ہوتے ہیں

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ہم بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ بڑے سخت تھے، ڈانٹ ڈپٹ کیا کرتے تھے لیکن ذرا تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھیے، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ جس وقت میں کسی کو ڈانٹ رہا ہوتا ہوں تو میری یہ کیفیت ہوتی ہے کہ (۱) میں دل میں اس کو اپنے سے افضل سمجھ رہا ہوتا ہوں اور محض اس کو اس کے فائدہ کے لیے ڈانٹ رہا ہوتا ہوں۔ (۲) پھر عین ڈانٹتے ہوئے اپنے دل میں یہ دعا کر رہا ہوتا ہوں کہ اے اللہ! میں اس کے ساتھ یہاں جیسا سختی کا معاملہ کر رہا ہوں کل قیامت کے دن آپ مجھ سے اس طرح سختی کا معاملہ نہ فرمائیے، مشائخ تو درحقیقت ایسے ہوتے ہیں۔ ان کے ظاہر کو دیکھ کر کوئی بھی فیصلہ لینا سراسر غلط ہے۔

حضرت جی قدّس سرّہٗ کی زندگی کے مرکزی عناوین

حضرت جی قدس اللہ سرہٗ واعلی اللہ مراتبہٗ کی حیاتِ مبارکہ پر اگر غور کیا جائے تو ایک مثلث ہے جس کے گرد حضرت کی پوری زندگی گھومتی ہے۔

(۱) عشقِ الٰہی:

اس بات سے کوئی چاہ کر بھی اختلاف نہیں کر سکتا کہ موجودہ دور میں ''حُبِ الٰہی اور عشقِ الٰہی''

کے موضوع کو جتنا حضرت نے اوڑھنا بچھونا بنایا؛ اور نہ صرف یہ؛ بلکہ ہر ٹوٹے پھوٹے دل میں اس کا بیج ڈالا، یہ چیز اس دور میں کہیں اور ویسے نہیں نظر آتی جیسے حضرت کے یہاں ہے کہ خود حضرت ہی نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: کہ ”میں نے اپنے اللہ سے ٹوٹ کر محبت کی ہے اور اسی پیغام کو میں نے پوری دنیا میں پہنچایا ہے، مجھے یقین ہے کہ میرا اللہ مجھے ضائع نہیں کرے گا۔“

انسان کو اپنے کسی بھی عمل پر ایسا ہی اعتماد ہونا چاہیے اور یہی وہ ”یقینِ محکم“ ہے جو مطلوب ہے۔

عشقِ الٰہی حضرت جی کا خاص موضوع

عشقِ الٰہی حضرت کا خصوصی موضوع ہے، حضرت کے متعدد بیانات ”وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ“ (سورۂ بقرہ، آیت: ١٦٥) سے شروع ہوتے ہیں (یعنی جو ایمان والے ہوتے ہیں اُن کی علامت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اللہ پر سو جان سے فدا ہوتے ہیں) اور یہ عشقِ الٰہی کی ابتدا ”ذکر“ سے ہوتی ہے، اور عشق بڑھتا ہے کثرتِ ذکر سے۔ ہم لوگ صرف ذکر کرتے ہیں، کثرتِ ذکر کرنا چاہیے، دونوں میں فرق ہے۔ تسبیح، تحمید اور تہلیل یہ سب ذکر ہیں؛ لیکن کثرتِ ذکر اور وہ بھی اسمِ ذات (اللہ) کا مطلوب ہے۔ دلیل: وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ (سورہ مزمل، آیت: ٨) ترجمہ: ”تیرے پروردگار کے نام کی مالا جپتے رہ“۔ اور رب کا نام ہے ”اللہ“۔ پس اللہ کا ذکر مراد ہے؛ ہاں! اس کثرت کی کوئی حد نہیں ہے، حضرت جی فرماتے ہیں کہ ”حضرت مرشدِ عالم پیر غلام حبیب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے ”ذکرِ کثیر اس کی ہے یہ تفسیر: اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ“ (سورۃ آل عمران، آیت: ١٩١)

ترجمہ: (عقلمند ہیں وہ) ”جو اللہ پاک کو یاد کرتے ہیں کھڑے بھی، بیٹھے بھی اور لیٹے بھی۔“ (یعنی تین حالتوں میں)

حضرت جی قدس سرہ اپنے معمول کے بارے میں فرماتے ہیں: ”ہمیں یونیورسٹی کے زمانہ میں (کثرتِ ذکر کے لیے) زیادہ موقع نہیں ملا کرتا تھا تو ہم چھٹی کے دن قضا کیا کرتے تھے اور وہ قضا ایسی ہوا کرتی تھی کہ نو نو گھنٹے کا مراقبہ بغیر حرکت کے ہوتا تھا اور اگر حرکت ہو جاتی تو از سرِ نو مراقبہ شروع کرتے۔“

حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا: ”مصلّٰی پر لمبا بیٹھنا (کثرتِ ذکر) ایک سعادت

ہے جو ہر کسی کے حصہ میں نہیں آتی ۔'' ہم سمجھتے ہیں کہ ہم کرلیں گے، ہمارے بس میں ہے ۔ جب تک اللہ نہ چاہیں ہمارے بس میں نہیں ہے۔

بہر حال کثرتِ ذکر کی یہ برکت ہے کہ عشقِ الٰہی حضرت کے انگ انگ میں ایسا سمو یا تھا، جیسا کہ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب مجنوں سمجھ کر بچوں نے پتھر مارے تو خون کا جو قطرہ بھی گرتا تھا اسمِ ''اللہ'' کا نقش بناتا تھا۔ یہ کثرتِ ذکر حضرت کی خصوصیت ہے۔اس (کثرتِ ذکر کے معاملے) میں حضرت نے کوئی سمجھوتہ یا کسی قسم کی رعایت نہیں کی۔ اگر ہم واقعی حضرت کے متبع ہیں اور حضرت کے سلسلہ سے منسلک ہیں پھر بھی کثرتِ ذکر سے مناسبت نہیں ہے تو حضرت کا نام لینا فضول ہے۔

(۲) عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ نتیجہ ہوا کہ حضرت بے ساختہ اتباعِ سنت کے عادی ہو چکے تھے۔ چاہ کر بھی اس سے باہر نہیں آسکتے تھے اور اس کی ابتدا اہتمامِ سنت سے ہوئی۔اہتمام سے حضرت کے اندر عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوا اور اس عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نتیجہ میں اتباعِ سنت عادت بن گئی۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی خادم نے خدمت کی غرض سے غفلت سے بائیں پیر پر پہلے ہاتھ رکھا جب کہ حضرت سو چکے تھے، حضرت نے فوری پیر کھینچا اور فرمایا کہ ''اتباعِ سنت کا اہتمام نہیں ہے! پہلے سیدھے پیر پر ہاتھ رکھو۔'' جوتا چپل حضرت کو پہنایا جائے یا اتارا جائے اور اس میں اگر خادم سنت کے پہلو کی رعایت نہ کرے تو حضرت پیر سمیٹ لیتے، اتباعِ سنت آپ کے اندر رچ بس گئی تھی اور یہ سنت کا اہتمام محبتِ رسول سے پیدا ہوتا ہے۔اسی لئے شرط ہے: ''لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ''

(صحیح بخاری، کتاب الایمان، بَابُ حُبِّ الرَّسُولِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الإِيمَانِ: ۱۵)

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بے تکلفی اور بے ساختگی کا مزاج تھا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اپنا کچا چٹھا پیش کر دیا کرتے تھے اور یہی چیز بعینہٖ ایک مرید سے اپنے شیخ کے ساتھ مطلوب ہے۔ چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ کہنے لگے: یارسول اللہ! بے شک مجھے آپ سے بہت محبت ہے؛ لیکن اپنی جان سے زیادہ محبت آپ سے محسوس نہیں کرتا

ہوں ’’یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا مِنْ نَفْسِي ‘‘ تو نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’لَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، حَتَّى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ ‘‘ ترجمہ: اللہ کے رسول! آپ کی ہستی میرے نزدیک ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے؛ سوائے اپنی ذات کے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں؛ اس ذات کی قسم! جب تک میں تمہاری اپنی جان سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں (تب تک کمالِ ایمان نصیب نہیں ہوسکتا)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تھوڑی دیر اپنی گردن جھکائی اور پھر سر اٹھا کر کہا: اے اللہ کے رسول! اب میں آپ کی محبت اپنے دل میں اپنے آپ سے بھی زیادہ محسوس کرتا ہوں تو نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: فَإِنَّهُ الْآنَ۔ ’’اب تم مؤمن ہوئے ہو‘‘؛ کیوں کہ جب تک سب سے زیادہ محبت نبی ﷺ سے نہ ہو ایمان کامل نہیں ہوسکتا۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے جیسے یہ شرطِ ایمان تھی ایسے ہی بعد والوں کے لیے بھی ہے۔

مرید کو اپنے شیخ سے بھی ایسی ہی محبت ہونی چاہیے؛ چناں چہ ہمارے حضرت جی قدس سرہ کو اپنے شیخ حضرت مرشد عالم پیر غلام حبیب رحمۃ اللہ علیہ سے ایسی ہی محبت تھی اور خود حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ کو بھی حضرت سے بے پناہ محبت تھی؛ اسی لئے کبھی کبھی حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ اپنے محبوب مرید حضرت جی قدس سرہ کو کھڑا کر کے مجمع سے خطاب کر کے فرماتے کہ ’’تم میں سے جسے یہ دیکھنا ہو کہ وہ کون ہے جسے سینکڑوں دفعہ نبی علیہ السلام کی زیارت نصیب ہوچکی ہو تو اسے دیکھ لے۔‘‘ یہ بات حضرت جی کے جوانی کے دور کی ہے، حضرت جی قدس سرہ اپنی عمر مبارک کے تیسویں سال کو پہونچنے تک سو دفعہ زیارت رسول ﷺ سے مشرف ہوچکے تھے۔ سوچیں ذرا آگے کیا حال ہوا ہوگا۔ حضرت جی قدس سرہٗ سے بارہا یہ شعر سنا؛ جو خود حضرت جی کے کتنا حسبِ حال ہے!

آنکھ والے تیرے جوبن کا تماشا دیکھیں
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

حضرت جی قُدِّسَ سِرُّہٗ حضرت سالم مولیٰ حذیفہ رضی اللہ عنہ کا وہ جو واقعہ تفصیلاً بیان فرماتے ہیں کہ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، انہوں نے ایک بچہ (جس کا نام سالم تھا، اس) کو اپنا متبنیٰ (منہ بولا بیٹا)

بنا لیا۔ پھر انہوں نے اس کی شادی اپنی بہن کے ساتھ کردی، وہ غلام تھا، متبنیٰ بنا اور قریش کے ایک بہت ہی معزز گھرانے کی بیٹی سے شادی ہوگئی۔ قریش نے انہیں اس بارے میں بہت ہی برا بھلا کہا کہ اس نے کتنا برا کیا۔ اور یہ کہا: کہ کیا تم نے قریش کی اتنی عقل مند شریف زادی کا نکاح ایک غلام کے ساتھ کردیا؟'' تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ہاں! میں نے یہ نکاح تو کیا ہے؛ مگر میں جانتا ہوں کہ وہ غلام اس عورت سے زیادہ بہتر اور افضل ہے۔'''' ان کی بات قریش کو اور زیادہ چبھی'' (ایک تو نکاح کیا اور آگے سے دلیل دیتا ہے کہ وہ زیادہ اچھا ہے) وہ کہنے لگے کہ'' وہ کیسے اچھا ہے؟ (اس قریشی عورت سے) یہ تمہاری بہن ہے اور وہ تمہارا مولا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا:'' میں نے نبی ﷺ کو یہ بات فرماتے ہوئے سنا: جو چاہے کہ کسی ایسے بندے کو دیکھے جو اپنے پورے دل کے ساتھ اللہ سے محبت کرتا ہے تو اسے چاہیے کہ سالم کو دیکھ لے۔''

چوں کہ سالم کا دل اللہ کی محبت سے لبریز ہو چکا ہے اور نبی ﷺ نے بھی گواہی عطا فرما دی۔ اب میری نظر میں وہ سالم کسی بھی قریشی عورت سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

أَنَّ أَبَا حُذَيْفَةَ بْنَ عُتْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ لَمَّا تَبَنَّى سَالِمًا مَوْلَاهُ، عَاتَبَتْهُ قُرَيْشٌ فِي ذٰلِكَ قَالُوا: أَنْكَحْتَ عَقِيلَةً مِّنْ عَقَائِلِ قُرَيْشٍ بِمَوْلًى؟ فَقَالَ: وَاللّٰهِ! لَقَدْ أَنْكَحْتُهُ وَإِيَّاهَا وَإِنِّي لَأَعْلَمُ أَنَّهُ خَيْرٌ مِّنْهَا فَكَانَ قَوْلُهُ أَشَدَّ عَلَيْهِمْ. فَقَالُوا: وَ كَيْفَ؟ وَهِيَ أُخْتُكَ وَهُوَ مَوْلَاكَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: مَنْ أَرَادَ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى رَجُلٍ يُحِبُّ اللّٰهَ عَلَى بِكُلِّ قَلْبِهِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى سَالِمٍ (خطبات فقیر: ج ۴۰ ص ۳۴، ۳۵)

تو یہی حال حضرت جی قدس سرہ کا ہے۔

خدمتِ مشائخ میں دل وزبان سنبھالنا

یہ بات مشہور ہے کہ حضرات علماء کرام کی خدمت میں جاؤ تو زبان سنبھال کر جاؤ اور مشائخ کی خدمت میں حاضری ہو تو دل سنبھال کر جاؤ۔ (جب دل سنبھالنا ہے تو زبان بھی سنبھالنا ہے) کبھی کبھار مشائخ اپنے متعلقین سے کچھ بے تکلفی سے پیش آتے ہیں، وہ اس لیے کہ کہیں وہ رعب اور تکلف کی وجہ سے کھل کر استفادہ نہ کر پائیں اور اپنا نقصان نہ کر بیٹھیں اور ضروری بات بھی معلوم نہ کریں۔ یہ

نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے سامنے ہم بھی مقرر اور واعظ بن جائیں، ہم بھی دعا دینے والے بن جائیں؛ چناں چہ ایک دفعہ ایسے ہوا کہ مدینہ منورہ میں ایک صاحب حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں دوران مجلس کہنے لگے کہ اللہ پاک آپ کو سلامت رکھیں! اس وقت حضرت پر ایک کیفیت طاری ہوگئی، اسی لئے کہتے ہیں کہ اللہ والوں کے پاس بہت سنبھل کر رہنا چاہیے؛ کیوں کہ ان کی کیفیت کب کیا ہوسکتی ہے؟ نہیں بتایا جاسکتا، اور وہ ایسے ہوتے ہیں کہ "لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ" (اگر کسی بات پر قسم اٹھالیں تو اللہ پوری کرنے پر آجائیں) حضرت فرمانے لگے: "مولوی صاحب! سلامت کسی نے بھی نہیں رہنا ہے! ہر ایک نے جانا ہے۔" پھر فرمانے لگے (دیکھیے! عشقِ الٰہی بھی دل میں کس قدر بھرا ہوا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق بھی کیسا ہے) "اس لمحے اگر مجھے یہ پتہ چلے کہ میرے اللہ مجھ سے راضی ہیں تو میں اگلے ہی لمحے دنیا سے جانے کے لیے تیار ہوں۔" اور آگے فرمایا: "میری اتنی بھی تمنا نہیں ہے کہ "بیوی سے مل لوں، بچوں کو سلام کرلوں" کیسا تعلق مع اللہ ہوگا! کیسا اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے دور اور آخرت سے قریب رہتے ہوں گے!۔

یہاں ہمیں کئی سبق ملتے ہیں، اتنے بڑے ہوکر بھی یہ فکر سوار ہے کہ فرما رہے ہیں: کہ "اس لمحے اگر مجھے یہ پتہ چلے کہ میرے اللہ مجھ سے راضی ہیں الخ" یہ نہیں کہ مجھ سے نہیں تو کس سے راضی ہوں گے۔ ایک ہم ہیں کہ ہم پر ذرا سی کیفیت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ تو ایسا ہونا ہی ہونا ہے، میرا اللہ کے ساتھ خاص معاملہ ہے، حضرت نے کبھی اس طرح کی بڑائی کا کوئی لفظ ارشاد نہیں فرمایا، الحمدللہ اِس عاجز کو خلوت وجلوت دونوں میں کافی شرفِ صحبت نصیب ہے، کبھی ایک لفظ بھی حضرت جی قدس سرہٗ نے ایسا ارشاد نہیں فرمایا جس سے اپنی تعریف کیا خصوصیت کا بھی ہلکا سا اظہار ہوتا ہو۔ جیسے حضرت اقدس شیخ المشائخ، قطب الاتقیاء اعلیٰ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ میں نے سترہ سال حضرت کی خدمت میں گزارے ہیں اور اس پورے عرصہ میں میں نے کبھی کوئی ایسا لفظ اپنے حضرت (اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری نَوَّرَ اللهُ مَرْقَدَهٗ) سے نہیں سنا جس سے اپنی تعریف کی بو آتی ہو۔ وہی کیفیت من وعن حضرت جی قدس سرہٗ میں موجود تھی۔

دنیا سے دور اور آخرت سے قریب ہو کر

حضرت اقدس مولانا شاہ مسیح اللہ خان جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ حضرت اقدس تھانوی علیہ الرحمہ) دورۂ حدیث میں داخلے کے امیدوار طلبہ سے فرماتے: ''دورۂ حدیث پڑھو، دنیا سے دور اور آخرت سے قریب ہو کر'' (ایک جملہ میں سمندر رہے) ہمارے حضرت کی پوری زندگی ایسی ہی گزری، دنیا سے دور اور آخرت سے قریب، ایسا لگتا ہے کہ وَ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی (سورہ الاعلیٰ:۱۷) والی آیت ذہن میں گھومتی رہتی تھی، دنیا کا کچھ بھی مسئلہ پوچھو آخرت سے جوڑ دیتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ حضرت کی شخصیت عشقِ الٰہی اور عشقِ رسول سے معمور تھی۔ حضرت کا ایک ملفوظ شریف مشہور ہے کہ ''جب موت کا وقت آئے، روح قبض کرنے والا فرشتہ آکر روح قبض کرنا چاہے اور ہمارے دماغ کو ٹٹولے تو اُسے علمِ الٰہی سے بھرا ہوا پائے، دل کو ٹٹولے تو اُسے عشقِ الٰہی سے بھرا ہوا پائے اور جسم کو ٹٹولے تو سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سجا ہوا پائے اور کانوں میں آواز آئے: یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ، ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً، فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ، وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (سورۃ الفجر:۲۸،۲۹،۳۰)''

اتباعِ سنت کا آخری درجہ

حضرت جی قدس سرہٗ کے یہاں اتباعِ سنت کا جو اہتمام تھا اس کو سمجھنے کے لئے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نور اللہ مرقدہٗ کا وہ ملفوظ ذرا سن لیں کہ حضرت فرماتے ہیں ''اب کوئی تمنا باقی نہیں رہی، سوائے اس تمنا اور آرزو کے کہ اتباعِ سنت کا مکمل حصہ نصیب ہو جائے۔'' اور حضرت کے یہاں تو کلامِ اکابر کی روشنی میں اتباعِ سنت کے کئی درجات ہیں (اس عنوان پر حضرت کے تفصیلی بیانات موجود ہیں) حتیٰ کہ سوچ میں بھی سنت کی پیروی ہوتی ہے۔ ہمیں جو وساوس آتے رہتے ہیں ذہن ہر وقت گندی سوچوں میں گھرا رہتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ہماری زندگی خلافِ سنت ہے۔ عمامہ باندھنے پر سنت کی انتہا نہیں ہو رہی ہے، ہم اپنے زعم میں یہ سوچ کر خوش ہو رہے ہوتے ہیں کہ ''عمامہ باندھنا'' متبعِ سنت ہونے کی علامت ہے جو میں نے باندھا ہوا ہے، کئی دفعہ تو عمامہ باندھتے ہوئے اتباعِ سنت کی نیت ہی نہیں ہوتی؛ بلکہ ''نقشبندی ہوں'' بتانے کی نیت ہوتی ہے اور یہ کہیں بھی نہیں لکھا ہے کہ

نقشبندی ہو تو عمامہ لازم ہے۔

سوچ میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی ہو، یہاں تک پہنچنا ہے، یہ اتباعِ سنت کا آخری درجہ ہے کہ انسان کی سوچ اور خیالات بھی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تابع ہو جائیں، اور حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے آپ کو یہاں تک پہنچایا تھا۔ اس کا پتہ کیسے چلا؟ حضرت کی خدمت میں جب بھی کوئی سوال کیا جاتا تو حضرت اس کا جو جواب ارشاد فرماتے تو اس سے پتہ چلتا تھا کہ سوچ کیسی ہے؟ اور اس سوچ کو حضرت نے متبعِ سنت کیسے بنایا ہے! اسی لیے حضرت اکثر فرمایا کرتے تھے ''فکر کی گندگی کثرتِ ذکر سے دور ہوتی ہے''۔

(۳) جو ملا ادب سے ملا

تیسری چیز جو حضرت کی زندگی میں سب سے نمایاں تھی وہ ''ادب'' ہے، ادب بہ ظاہر ان دونوں (عشقِ الٰہی اور عشقِ رسول) کے بعد ہے؛ لیکن ان دونوں میں جان اسی سے پڑے گی۔ حضرت خود ارشاد فرماتے تھے: ''مجھے جو ملا ہے ادب سے ملا ہے۔'' حضرت نے ایک دفعہ واقعہ سنایا کہ ''میں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ کا چہرہ بے وضو نہیں دیکھنا ہے اور میرا اس پر پورے اہتمام کے ساتھ عمل ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میرے بستر پر سو جاؤ! اب میں کشمکش میں پڑ گیا کہ حکم کی تعمیل کروں کہ اپنا معمول پورا کروں! حکم کی تعمیل کرتا ہوں تو وضو جائے گا۔ (کیوں کہ نیند سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور سو کر اٹھوں گا تو بغیر وضو کے حضرت کا چہرہ دیکھوں گا) اب کیا کروں؟'' حضرت فرماتے ہیں کہ ''میں لیٹ گیا، اور یہ سوچا کہ حکم کی تعمیل لیٹنے سے ہو جائے گی، اور وہ کام نہیں کروں گا جو جاگنے والا کرتا ہے یعنی سوتا ہوا بنوں گا، تو میں نے پورا وقت ویسے ہی (بغیر سوئے) گزارا، جب اٹھا تو با وضو تھا اور حضرت کا چہرہ با وضو دیکھا۔'' یہ ہے کمالِ ادب!۔

اکابر کی ابتدائی زندگی دیکھنا چاہیے نہ کہ بعد کی

ہم میں سے اکثروں نے حضرت جی قدس سرہٗ کا صرف بعد والا زمانہ دیکھا ہے، خود یہ عاجز بھی اُس دورِ بہاراں سے محروم ہے جب ہمارے حضرت جی وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ رَبِّهِ (وہ

سات قسم کے لوگ جنہیں کل قیامت کے دن عرشِ الٰہی کا سایہ نصیب ہوگا، ان میں سے ایک ایسا جہانِ رعنا بھی ہے جو عبادتِ رب میں پروان چڑھا ہو) کا مصداق تھے۔ (بخاری)

بقول حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ: ''جو ہمارے اکابر کی انتہا دیکھے وہ ناکام اور جو ابتدا دیکھے وہ کامیاب'' لہٰذا حضرت کی ابتدا دیکھنے والے لوگوں سے پوچھیں کہ حضرت کون ہیں؟ حضرت جی قدس سرہ کی ابتدائی زندگی کو سمجھنے کے لیے یہ ایک واقعہ کافی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جی قدس سرہٗ چوبیس گھنٹے کا انتہائی پر مشقت سفر کر کے ایک صاحب کے پاس صرف اس نیت سے گئے تھے کہ اُنہیں حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ کے پیر دبانے کا سلیقہ آتا تھا، میں جا کر سیکھوں گا۔ چنانچہ صرف اسی مقصد سے تشریف لے گئے اور فوری واپس بھی آ گئے، کُل اڑتالیس گھنٹے کا سفر فرمایا اور پیر دبانا سیکھ کر آئے۔ یہ عاجز جب بھی حضرت کے قدموں میں بیٹھا کرتا تھا اور مٹھی چاپی کا کچھ موقع نصیب ہو جاتا تو عاجز یہی سوچتا رہتا کہ چوبیس گھنٹے کا سفر کر کے پیر دبانا سیکھ کر آنے والے کو یہ پیر دبانا کیسا لگ رہا ہوگا؟ میں تو سوائے تکلیف کے کچھ اور نہیں دے رہا ہوں۔ حضرت کو اپنے شیخ سے ایسی محبت تھی، ایسے ایک دو نہیں بلکہ کئی واقعات ہیں۔ تب ہی تو حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''یہ ذوالفقار ہے اور اس پر تو میری جان بھی قربان ہے۔'' کسی نے ایک دفعہ پوچھ لیا کہ حضرت! یہ آپ کے بیٹے ہیں؟ حضرت چند لمحوں کے لئے خاموش ہوئے، پھر فرمایا: ''ہاں! میرے بیٹے ہیں۔''

ادب ہی شانِ اکابر اور وصفِ اولیاء ہے

حضرت نے اپنی زندگی میں ادب کا بہت خیال رکھا۔ حضرت اقدس تھانویؒ کا ایک ملفوظ ہے، حضرت فرماتے ہیں کہ ''میں نے سارے ہی اللہ اللہ کرنے والوں کا ادب کیا ہے اور ہمیشہ ان کی دعائیں لی ہیں، گو ان میں بعض سے فکری اختلاف بھی رہا ہو مگر میں نے ان کی بے احترامی نہیں کی۔ آگے فرماتے ہیں: ''گو میں صاحبِ فتویٰ ہوں اور ان حضرات سے کچھ لغزشیں ہو بھی جاتی ہیں؛ مگر میں نے کبھی کسی اہلُ اللہ کے خلاف فتویٰ نہیں دیا'' یہ ادب ہمارے تمام اکابر کی شانِ امتیازی ہے۔ ہمیشہ اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اپنے مشائخ کو کبھی ہم سے تکدر نہ ہو۔ حضرت کا تکدر کیا چیز تھی؟ عاجز کا اس پر یقین ہے کہ ملی ہوئی نسبت کا چھن جانا تو ہے ہی، آگے نسبت کا نہ ملنا بھی یقینی ہے۔ اس

لیے کہ دل جتنا صاف وشفاف ہوگا اس پر ہلکی سی بھی گرد بھی اسی قدر محسوس ہوگی۔ یہ وہ شخصیتیں ہوتی ہیں کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی مرید نے کہا: کہ حضرت میں نے آپ کو خواب میں فلاں جانور کی شکل میں دیکھا ہے تو حضرت نے فرمایا: ''وہ دراصل تمہاری شبیہ ہے؛ چونکہ میں تمہارے لیے مثلِ آئینہ ہوں، اس لیے جب تم میرے سامنے آئے تو مجھ میں تمہیں اپنی شکل دکھائی دی۔''

ہم اس کو سامنے رکھ کر یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ کبھی ہمارے ذہن میں اکابر کے تعلق سے جو نامناسب خیال اور گھناؤنے قسم کے وساوس آجاتے ہیں وہ دراصل ہماری مکروہ ذہنیت کا عکس ہوتے ہیں۔

ادب کے باب میں حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس انتہا درجہ حساسیت تھی۔ ایک دفعہ کی بات ہے کہ حضرت جی تشریف فرما ہیں، ایک نجی مجلس ہے، حضرت کے خدام میں سے ایک صاحب نے ایک بچے کو چھیڑا، ظاہر ہے حضرت کی موجودگی میں انتہائی واہیات حرکت تھی اس پر مستزاد اُس وقت اِس بے ادب اور نالائق کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی، حضرت نے عاجز کو جو دیکھا ہے، وہ دیکھنا آج تک یاد ہے، اس میں ڈانٹ بھی تھی، نصیحت بھی تھی، اس میں شفقت بھی تھی، بلا کی توجہ بھی تھی۔ کسی بھی مجلس میں ہنسنے سے پہلے ہمیشہ حضرت کی وہ نگاہ یاد آجاتی ہے، حضرت کا اصلاح وتربیت کا بہت خاص انداز تھا۔ حضرت کی اصلاح کے انداز کو وہی سمجھ سکتا ہے جو حضرت جی قدس سرہٗ کے سامنے واقعی زانوئے ادب تہ کیا ہو، اور سامنے خادمانہ بیٹھا ہو۔

اجازت وخلافت کی حقیقت

حضرت جی قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ''جن کو اجازت وخلافت دی جاتی ہے اُن کے تعلق سے یہ بتانا مقصود نہیں ہوتا کہ کوئی بہت پہونچے ہوئے اور کامل ولی ہیں، فلاں ہیں وغیرہ، بس استعداد کی اطلاع مقصود ہوتی ہے۔ جب باغ بڑا ہوجاتا ہے، پھیلنے لگ جاتا ہے اور مالی سے سارا باغ سنبھالا نہیں جاتا تو وہ باغ سنبھالنے کی ڈیوٹی کسی اور کے بھی ذمے لگاتا ہے۔ اجازت وخلافت کی بس یہی مثال ہے کہ مالی کے معاون بڑھا دیے گئے۔''

حضرت جی قدس سرہٗ اجازت دیتے ہوئے جو سارے کَس بَل نکالا کرتے تھے وہ خاصے کی چیز ہوا کرتی تھی۔ حضرت کی بات مخصوص انداز میں یوں شروع ہوتی تھی کہ ''ماں باپ جب دیکھتے ہیں

کہ بچہ بہت بگڑ رہا ہے تو شادی کر دیتے ہیں کہ کم از کم شادی کے بعد سدھر جائے گا اور ذمے داری کا احساس پیدا ہوگا، جینے کا سلیقہ آ جائے گا وغیرہ۔'' بوقتِ اجازت جو دستار باندھی جاتی تھی تو ساتھ میں یہ ساری باتیں دماغ کا ہمیشہ کے لیے حصہ بنائی جاتی تھیں۔ پھر حضرت جو عہد لیا کرتے تھے کہ ''کمینی دنیا سے منہ موڑیں گے، نسبتِ شریفہ کی اشاعت کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دیں گے''۔ تو یہ فکر سر پر سوار ہو جاتی کہ اب سونے کا اور غفلت کا وقت نہیں رہا۔

مریدین کی کثرت پہ نازاں نہ ہوں

حضرت جی قُدِّسَ سِرُّہٗ فرمایا کرتے تھے ''مریدین کی کثرت پہ خوش ہونے کا کوئی موقع ہی نہیں ہے کہ کثرت کا معیار یہ ہے کہ آپ کے مریدین شیطان کے مریدین سے زیادہ ہوں اور یہ کبھی ہونے سے رہے۔ پس موت تک بھی آپ مریدین کی کثرت پہ نازاں نہیں ہو سکتے کہ میرے مریدین بہت ہو گئے۔'' آج کل کے مریدین چاہے جتنے ہوں، بیچارے مسلوب الارادہ تو ہوتے نہیں، وہ خود ہی مشائخ کو چلاتے ہیں، تو اُن جیسوں کی زیادتی ویسے بھی کوئی تفاخُر کی وجہ نہیں۔ ہمارے مشائخ بھی بڑے سیدھے سادھے ہوتے ہیں، چوں کہ سراپا حسنِ ظن ہوتے ہیں اس لیے کوئی شاطر قسم کا بھی ہوتا ہے تو بر بنائے حُسنِ ظن اس کے بھی تابع ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بہت بڑا آدمی ہے، بہت خاص آدمی ہے؛ بلکہ آج کل کے مریدین کو تو اپنے مشائخ سے ہی اختلاف ہو جاتا ہے۔ (آخر یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ مرید کی حیثیت کیا ہے؟)

اختلاف کرنا اور اختلاف رکھنا

شیخ سے اختلاف رکھنا الگ ہے اور کرنا الگ ہے، دونوں میں فرق ہے۔ شیطان نے اختلاف کیا: خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (سورہ صٓ:۷۶) ترجمہ: ''مجھے آگ سے بنایا ہے اور اس کو مٹی سے'' آگ اوپر کی جانب اُٹھتی ہے، اس کے اندر استعلاء (بلند ہونے) کی صفت ہے۔ آدم کو مٹی سے پیدا کیا، مٹی تو نیچے کو جاتی ہے، پھر میں کیسے آدم کو سجدہ کروں؟ مجھے اس بات سے اختلاف ہے۔ تو اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ''اچھا! اتنے بڑے ہو گئے؟ فرشتوں کو پڑھاتے تھے، اب مجھے بھی پڑھاؤ گے؟ چوں کہ شیطان کا یہ اختلاف دراصل تکبر پر مبنی تھا، اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ (سورہ

بقرہ:۳۴) اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: اخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ (سورہ ص، آیت: ۷۷) ''نکلو یہاں سے آج سے تم مردود ہو۔ یہاں سے ایک بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مشائخ سے اختلاف (بر بنائے ہمہ دانی، بر بنائے علم، بر بنائے صلاحیت واستعداد) انسان کو رد ضرور کرے گا، آج نہیں تو کل، مشائخ کی زندگی میں اپنے پھلنے پھولنے پر بھی ہمیں اعتماد نہیں ہونا چاہیے۔

شیخ کی ناراضگی کا انجام

حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خلیفہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک فارسی رسالے کا ترجمہ کروایا، جو''مقالاتِ صوفیہ'' کے نام سے طبع ہوا، اس میں متقدمینِ اکابر کے اقوال ہیں۔ چنانچہ اس میں ایک بزرگ کا قول جھنجھوڑ کر رکھنے والا ہے، فرماتے ہیں: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ پاک کسی سے اپنے ولی کی شان میں کی گئی بے ادبی پر انتقام لینا چاہتے ہیں؛ لیکن اُس ولی اور اپنے مقبول بندے کی حیات تک نہیں لیتے، اُس بے ادب کو مہلت دیتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ وہ ولی اللہ اس پر مہربان ہو جائے اور اُس بندے کے لیے بلک کر، تڑپ کر ایسی دعائیں کرے، کہ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ کے تحت اللہ پاک کو بات ماننی ہی پڑے۔ کیوں کہ اولیائے کرام کی سرشت میں عفو وکرم بھرا ہوتا ہے۔ نیز مشائخ نیابتِ نبوت کے اعتبار سے بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ کے بہت زیادہ مظہر ہوتے ہیں۔ اگر اللہ کی طرف سے ہلکی سی بھی آنچ آتی ہے تو وہ تڑپ جاتے ہیں اور پیارے اللہ سے لگ لپٹ کر اُس کے لیے معافی کی بھیک مانگتے ہیں۔ اس لیے اللہ پاک اپنے اولیاء کی حیات میں ڈھیل دیتے ہیں پھر جب اُس ولی اللہ کی وفات ہو جاتی ہے تو اللہ پاک اُسے دی گئی تکلیفوں کا بدلہ چُن چُن کر لیتے ہیں'' (مقالات صوفیہ، ص: ۵۴)

اختلاف رکھنے کی مثال

حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک معاملے میں اختلاف رکھا ہوا تھا، اختلاف کیا ہوا نہیں تھا؛ بلکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ میں تو اپنے شیخ کی عقیدت ومحبت اور کمال درجے کا ادب اس قدر تھا کہ خود ہی فرماتے ہیں: ''ایک مجلس میں جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہوں، بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہوں، شبلی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہوں، اور ایک

طرف ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہوں، ہم ہمارے حاجی صاحب کے سوا کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ اور جب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ''ہفت مسئلہ'' حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو پیش کیا گیا تو فرمایا کہ ''اسے حمام میں جھونک دو۔'' کسی نے کہا کہ اپنے شیخ کا رسالہ حمام میں جھونک رہے ہیں؟ فرمایا: ''ہمارے شیخ کے ہاتھ پر ہم نے جو بیعت کی ہے وہ طریقت میں کی ہے، طریقت میں ہم اُن کے تابع ہیں شریعت میں نہیں۔'' (مجالسِ حکیم الاسلام: ۱/۱۲۹)

شیخ سے عقیدت ومحبت

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ بجائے خود بڑے بڑے لوگ ہیں مگر انہوں نے پوری زندگی اپنے کو شیخ کے نام معنون کر رکھا تھا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے

تمہاری کیا حقیقت تھی میاں آہ
یہ سب امداد کے لطف و کرم تھے

اور یہ چیز ادب سے ملتی ہے، ''ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں''۔

شیخ شیخ ہوتا ہے

حضرت جی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ''ایک مرتبہ حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے شیخ حضرت خواجہ عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: آج آپ بیان کیجیے۔ تو حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا، بیان کے بعد مراقبہ کروایا، مراقبے میں توجہ کا عمل بھی کیا، پھر دعا کروا کر شیخ کے حجرے میں گئے تو حضرت صدیقی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بھائی غلام حبیب! تم نے تو توجہ میں مجھے بھی شریک کر لیا۔'' پتہ چلا کہ شیخ شیخ ہی ہوتا ہے، مرید مرید ہی ہوتا ہے۔''

اِس دورِ قحط الرجال میں حضرت جی قدّس اللہ سرّہٗ کا وجود ایک نعمتِ عظمیٰ تھا

دور بیٹھا کوئی دعائیں دیتا ہے
میں ڈوبتا ہوں سمندر اچھال دیتا ہے

یہ شعر پوری زندگی حضرت جی قُدِّسَ سِرُّہٗ کے حسبِ حال رہا کہ ہمیشہ اپنے احباب کی طرف

کامل و مکمل متوجہ رہا کرتے تھے۔ اپنے خلفاء و مجازین سے فرمایا کرتے تھے کہ "آپ ایک سالک کو توجہ دیں گے تو اُس توجہ کا فائدہ آپ کو بھی ہو گا ایسے ہی دس، سو جتنے سالکین کو توجہ دیں گے اُتنا ہی فائدہ آپ کو ہوا کرے گا کہ ہمارے سلسلے میں سالکین کو توجہ دینے کا فائدہ خود شیخ کو بھی ہوتا ہے۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت جی قُدِّسَ سِرُّہٗ کس قدر اپنے سالکین کی طرف دعاؤں اور توجہات کے ذریعہ مشغول رہا کرتے تھے۔

حضرت جی قدس سرہٗ کی نوعمری کے چند واقعات

حضرت جی قُدِّسَ سِرُّہٗ واعلی اللہ مراتبہٗ سے ایک دفعہ ایک بڑے عالمِ دین نے سوال کرلیا کہ حضرت آپ پہلے تو عصری علوم والی لائن میں تھے پھر کیسے دینی لائن کی طرف توجہ کا معاملہ بنا؟ حضرت جی نے اس پر مندرجہ ذیل باتیں ارشاد فرمائیں۔ (یہ عاجز اس وقت حضرت کے قدموں میں حاضر تھا اور اپنے کانوں سے یہ واقعات الحمدللہ براہِ راست سنے)۔ چنانچہ حضرت نے ارشاد فرمایا: "مولانا! میری تین سال کی عمر سے کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ بارہ سال کی عمر سے کوئی تہجد قضا نہیں ہوئی۔ بارہ سال کی عمر ہی سے الحمدللہ عاجز نگاہیں نیچی کیے ایسے چلتا تھا کہ ایک دفعہ (خاندان کی) بعض عورتوں نے والدہ محترمہ رحمۃ اللہ علیہا سے شکایت کی کہ "یہ تمہارا بچہ ہمیں سلام نہیں کرتا" تو والدہ ماجدہ نے ڈانٹ پلائی کہ بیٹا یہ تمہاری خالہ ہیں، ماں کی عمر کی ہیں، ماں جیسی ہیں اور تم اُن کو سلام نہیں کرتے، تم میں بڑوں کا ادب نہیں ہے! حضرت فرماتے ہیں کہ "میں نے ساری ڈانٹ سن لی؛ میرا والدہ کے ساتھ عجیب معاملہ تھا، چوں کہ میں سب بھائی بہنوں میں چھوٹا تھا تو اپنی ماں کا بہت لاڈلا تھا مجھے بھی ان سے بہت محبت تھی، انہیں بھی مجھ سے بہت شدید محبت تھی۔ اب جب والدہ ماجدہ نے اُن کی طرف سے شکایت کی تو میں نے بس اتنا کیا کہ منہ پھلایا اور آکر کمرے میں لیٹ گیا۔ کچھ کہا نہیں کوئی جواب نہیں دیا۔ جب کچھ دیر گزری تو اماں آئیں اور اُنہوں نے فرطِ محبت میں میرے پیروں پہ بوسہ دیا، پھر ڈھیر ساری دعائیں دینے لگیں اور کہا کہ بیٹے! میں تیرے فائدے کے لیے، تیری اصلاح کے لیے کہتی ہوں، مجھے کوئی دشمنی تھوڑی ہے؟ جب ماں نے اپنی ممتا دکھائی تب میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ امی! آپ ذرا ان سے پوچھنا کہ کیا میں اُن آنٹیوں کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتا ہوں؟ والدہ ماجدہ

نے کسی اور وقت اُن سے پوچھ کر بتایا کہ ہاں وہ تو کہہ رہی ہیں کہ تم اُن کو دیکھتے نہیں ہو، تو پھر میں نے اُس وقت اپنی والدہ سے عرض کیا کہ اب آپ ہی بتائیے کہ جب میں دیکھتا نہیں تو سلام کیسے کروں گا؟۔''

حضرت فرماتے ہیں:

''میں بارہ سال کی عمر سے ہی آنے جانے والوں کے جوتے چپل پر بھی نگاہ نہیں ڈالتا تھا اُس دور میں ایسے جوتے چپل ہوا کرتے تھے کہ اُن کی آواز سے مرد عورت کے فرق کا پتہ چلتا تھا تو سمجھ آتی تھی کہ بازو سے مرد گزرا کہ عورت۔'' نگاہوں کی حفاظت کا اتنا اہتمام تھا! اور یہ جملہ حضرتؒ ہی سے پہلی بار سننے کو ملا کہ ''تم مردوں سے اپنی نگاہوں کی حفاظت کرو، عورتوں سے نگاہوں کی حفاظت آسان ہوگی'' ہمارا نفس اتنا سڑا ہوا اور اتنا بدبودار ہے، اور اتنا گندگی کی طرف مائل ہے کہ بھلے وہ مرد ہو؛ لیکن چہرہ خوبصورت ہو تو نگاہ ٹک جاتی ہے، یہ فسادِ قلب ہے۔ اور یہ علامت ہے کہ اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ حضرت مزید فرمانے لگے کہ ''دورانِ طالبِ علمی میرا تو اُن عمارتوں سے بھی پردہ ہوتا تھا جہاں نامحرم لڑکیاں ہوا کرتی تھیں، چنانچہ جب مجھے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ وہ فلاں عمارت گرلز ہاسٹل ہے تو میرا راستہ بدل گیا۔ حالاں کہ وہاں پورے پانچ سال ہمارا قیام رہا؛ مگر ایک دفعہ بھی اس عمارت کی طرف نہیں دیکھا۔'' پتہ چلا کہ صرف نامحرم کی ذات سے پردہ نہیں؛ بلکہ متعلقاتِ خواتین سے بھی پردے کا یہ عالم ہے۔ یہ ہے اصل روحِ تقویٰ۔

حضرت سے ایک موقع پر صاحب زادہ صاحب نے کوئی بات پوچھی تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ''بیٹے! میں نے آج تک کسی نامحرم کو نہیں دیکھا'' ہمیں پورا یقین ہے کہ حضرت جھوٹ نہیں بول سکتے، اس لیے کہ سچ کی تعریف اور دعاؤں کے قبول ہونے کا سبب ہم نے اُن سے سنا کہ ''جو ہمیشہ سچ بولنے کا اہتمام کرتا ہے اللہ پاک اُس کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات سچی کر دیتے ہیں۔'' آج بھی حضرت جی قُدِّسَ سِرُّہٗ کی دعاؤں کی قبولیت کا مشاہدہ کرنے والے ان گنت لوگ موجود ہیں۔ حضرت جی نے بہت پہلے ایک دفعہ اپنے کسی خادم سے فرمایا کہ ''اب تو بس میرا اپنے اللہ سے کہنا ہی کافی ہوتا ہے پیارے اللہ سن لیتے ہیں۔''

کم سنی میں مُستَجابُ الدَّعوَات بننے کا شوق

حضرت جی قدس سرہٗ نے یہ بات اکثر ارشاد فرمائی ہے کہ: ”جس کی زبان سے ہمیشہ سچ نکلتا ہے اللہ پاک اس کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات سچی کر دیتے ہیں“۔ حضرت فرماتے ہیں: ”میری دس سال کی عمر تھی، ایک بزرگ کی خدمت میں بہت جایا کرتا تھا، لوگ وہاں سے چلے جاتے تھے، میں بیٹھا رہتا تھا، وہ مجھے دیکھ کر مسکراتے تھے، میں چھوٹا سا بچہ مریدان سے کیا سنوں اور کیا وہ مجھے نصیحت کریں! ایک مرتبہ پتہ نہیں میرے دل میں کیا خیال آیا کہ میں نے ان بزرگ سے عرض کیا حضرت! دعا کر دیجیے کہ میں مُستَجَابُ الدَّعوَات ہو جاؤں۔ یہ سن کر وہ بزرگ مسکرانے لگے اور فرمایا کہ بچہ قریب آؤ تو میں قریب گیا، فرمایا کہ ”تم ہمیشہ سچ بولا کرو! جس کی زبان سے ہمیشہ سچ نکلتا ہے اللہ پاک اس کی دعائیں قبول کر لیتے ہیں“۔

حضرت کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی دو باتیں

ہمیں بطورِ خاص حضرت کی حیات طیبہ سے ”ادب“ سیکھنے کی چیز ہے۔ حضرت نے صاف فرمایا ہوا ہے: کہ ”مجھے جو کچھ ملا ہے ادب سے ملا ہے“۔ والدین چونکہ ایسے نہایت باادب، ستودہ صفات تھے تو حضرت جی قُدِّس سِرُّہٗ میں بھی وہ چیز بدرجہ اتم منتقل ہوئی۔ حضرت کے والد محترم رحمۃ اللہ علیہ کے وفات پا جانے کے بعد تک کچھ باتیں راز ہی تھیں۔ جیسے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ نے حضرت جی قدس سرہٗ سے دو باتیں بیان فرمائیں: ایک یہ کہ ”تمہارے والد نے کبھی ایسی سبزی نہیں کھائی جس کا رنگ سبز ہو، ہمیشہ فرماتے تھے کہ گنبد خضرا کا رنگ سبز ہے، میں اس رنگ کی سبزی کھا کر اُسے فضلہ بنانا نہیں چاہتا۔ اللہ اکبر کبیرا! ذرا سوچیں کہ یہ کوئی معمولی مجاہدہ ہے؟ وہ بھی زندگی بھر کا! جس کے والد حقیقی معنوں میں ”ایسے ماجد ہوں“ تو اُس بیٹے کے سراپا ادب و نیاز و مجسمِ اخلاق ہونے پر کوئی تعجب نہیں۔ لوگوں کے تعجب پر ہمیں تعجب ہوتا ہے، دراصل لوگ جو چیز جانتے نہیں ہیں اس کے تعلق سے دشمن بن جاتے ہیں۔

دوسری بات حضرت جی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ”ہم دیکھتے تھے کہ والد ماجد جب بھی کوئی سالن بنتا تو پانی کا ایک گھونٹ یا دو گھونٹ اُس کے شوربے میں ملا لیا کرتے تھے، ہمیں سمجھ نہیں آتی تھی

کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ بعد میں جب ہم کچھ اور بڑے ہوئے تو والدہ ماجدہ سے اس کی تفصیل پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ بچہ! تمہارے والد کہتے تھے کہ نفس مزے لینے کا عادی ہے، اس کو اس بات کا عادی بنانا ہے کہ وہ مزے لینے والا نہ بنے، اس لیے سالن کا پورا مزہ حاصل نہ ہو میں اُس میں پانی کے دو گھونٹ ڈال دیتا ہوں تا کہ نفس اعتدال پر رہے۔''

کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گزر گئے

حضرت کی والدہ ماجدہ رحمۃ اللہ علیہا کا تعلق مع اللہ اور مزاجِ وفا

حضرت جی قُدِّسَ سِرُّہٗ اپنی والدہ ماجدہ کا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ ''ایک مرتبہ ہمارے ہاں سیلاب آیا جس کی وجہ سے گھر میں گھٹنوں تک پانی بھر گیا۔ والدہ ماجدہ رحمۃ اللہ علیہا نے ہم بچوں کو اوپر طاقوں میں بٹھا دیا اور خود پانی میں کھڑی ہو گئیں۔ جب پانی بہت زیادہ زور دکھانے لگا تو والدہ ماجدہ نے ہاتھ اٹھائے اور پنجابی زبان میں فرمانے لگیں: ''اے میرے سوہنے اللہ! ہن بس چا کر'' (اے میرے پیارے اللہ! اب بس بھی کر دیجیے۔) حضرت فرماتے ہیں ''پانی یوں تھا جیسے برسا ہی نہیں تھا، آنِ واحد میں بارش بند ہو گئی۔'' حضرت فرماتے ہیں کہ ''والدہ ماجدہ کی نوے سال سے اوپر کی عمر تھی اور وہ ہتھیلی کے برابر سائز کی چپاتی بڑی مشکل سے کھاتی تھیں، وہ بھی ہمارے بہت اصرار پر اور اُن کا یہ حال مسلسل روزوں کے معمول کے ساتھ تھا۔'' شوہر سے اس قدر وفا کا جذبہ کہ حضرت فرماتے ہیں: میں نے جب اپنا گھر تعمیر کر لیا تو اپنی والدہ ماجدہ سے کئی دفعہ کہا کہ میرے گھر چلے آئیں، وہاں رہیں، مگر وہ ٹال جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے ناز میں آ کر تھوڑا سا اصرار سے اپنی ماں سے کہا کہ تو کہنے لگیں: بچہ! اصل بات یہ ہے کہ تمہارے ابو جس گھر میں مجھے بیاہ کر لائے تھے نا میں چاہتی ہوں کہ وہیں سے میرا جنازہ اٹھے۔ مجھے یہاں سے کہیں اور جانا نہیں ہے۔'' حضرت فرماتے ہیں کہ ''اس کے بعد پھر میں نے کہنا چھوڑ دیا''۔

بہر حال حضرت کے یہ تین اہم مرکزی نقطے ہیں جن کے اطراف حضرت کی پوری زندگی گھومتی تھی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان اہم چیزوں کو اپنائیں تا کہ ہمیں بھی سعادتوں سے حصہ ملے۔ ہمیں صرف حضرت کی تصویر کو سینے سے لگانا نہیں ہے بلکہ اس سے تو ڈر ہے کہ کہیں یہ چیز وہیں پر نہ لے

جائے جس کی بنیاد پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تصویر سے منع فرمایا تھا یعنی تصویر پرستی جو کہ سراسر شرک ہے۔

حضرت جی سے کئی دفعہ سنا، فرماتے تھے کہ ''کسی بھی پروگرام میں جلسے وغیرہ میں صدر آخر میں آتا ہے، اس کے آنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جلسہ برخاست ہوا چاہتا ہے۔'' ایسے گئے گزرے دور میں ایسی عظیم المرتبت شخصیت جسے بالیقین پچھلے قافلے کا بچھڑا ہوا ایک فرد کہنا چاہیے، بسا غنیمت اور بہت سے فتنوں سے بچاؤ کا ذریعہ تھی، وہ بھی اپنی حیاتِ مستعار کی طے شدہ ساعتیں مکمل کر کے ہمیشہ کے لیے مکینِ خُلد آشیاں ہوگئی۔ طَابَ اللّٰہُ ثَرَاہُ وَجَعَلَ الْجَنَّۃ مثواہ، آمین۔

☆☆☆

درس عقائد

عقائد کی تعلیم ،ضرورت واہمیت

قسط (۱)

ضبط وترتیب : مفتی سیف اللہ قاسمی صاحب

درست عقائد کی اہمیت

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عقیدہ کی حیثیت بنیاد کے پتھر کی طرح ہے،صحیح عقیدے کے بغیر آخرت کے عذاب سے نجات ممکن نہیں ہے،جبکہ عمل صالح کے بغیر نجات کی امید ہے۔البتہ معاملہ اللہ کی مشیت کے سپرد ہے۔اللہ چاہیں تو اپنی رحمت سے معاف فرمادیں گے اور چاہیں تو قانونِ عدل سے سزا دیں۔چناں چہ یہ بات جان لینی چاہیے کہ کسی ایک عقیدے میں بھی بگاڑ اور خرابی ہو تو آگے اسلام کی پوری عمارت خراب رہے گی۔ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

ترجمہ: اگر معمار پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھے،تو دیوار ثریا ستارے تک ٹیڑھی جاتی ہے۔

عقائد کیا ہیں؟

ایمان مجمل اور ایمان مفصل میں جو کلمات ہم پڑھتے رہتے ہیں،وہی اسلامی عقائد کا خلاصہ ہیں۔لہٰذا صحیح اور درست عقائد کی تفصیلات جاننا،دل سے ان کا اقرار کرنا اور پوری زندگی ان پر قائم رہنا بہت ضروری ہے۔یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے صحیح عقائد کی تعلیم ،اسلامی تعلیم کا اٹوٹ حصہ رہی ہے، بچپن میں مکتب ہی سے اس کا آغاز کردیا جاتا ہے اور عام فہم الفاظ میں،عقائد کی جو باتیں ضروری ہیں، وہ سکھادی جاتی ہیں۔اس سلسلے میں بہت سی جگہوں پر تعلیم الاسلام پڑھائی جاتی ہے۔

(استاذ المعہد العالی الاسلامی ،پلمنیر)

عقیدہ اور عمل میں فرق:

عقیدہ اور عمل کے درمیان کئی اعتبار سے فرق ہے۔ مسلمانوں میں عموماً اعمال کی درستی کی تو فکر ہے لیکن درست عقائد جاننے کے لیے اتنا اہتمام نہیں، جتنا کہ ہونا چاہیے۔ عقیدے اور عمل کے مابین سب سے پہلا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ عقیدہ اصل ہے اور عمل فرع۔ یعنی جو فرق اصل اور فرع میں ہے، وہی عقیدہ اور عمل کے درمیان بھی ہے۔ اسی طرح ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ عقیدہ کا محل دل ہے اور اعمال کا محل بدن۔ یعنی عقائد کی باتیں دل میں مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی رہتی ہیں اور اعمال بدن کے ظاہر سے انجام پاتے رہتے ہیں۔

عقیدے اور عمل کے درمیان مذکورہ فرق کی حکمتیں:

(۱) جو چیز جتنی قیمتی ہوتی ہے، اس کے رکھنے کی جگہ بھی اتنی ہی محفوظ ہوتی ہے اور جو چیز نسبتاً اس سے کم قیمت ہو اس کے رکھنے کا محل بھی اسی اعتبار سے کم محفوظ ہوتا ہے۔ عقیدہ چونکہ بہت ہی زیادہ قیمتی چیز ہے اس لیے اس کا محل دل کو بنایا گیا اور عمل، عقیدے کی بہ نسبت کم قیمتی ہے، اس لیے اس کا محل اعضائے بدن کو بنایا گیا۔

(۲) انسان کے جسمانی اعضاء میں سے بعض کٹ بھی جائیں تب بھی وہ زندہ رہ سکتا ہے؛ لیکن دل ایسا قیمتی عضو ہے کہ اس کا کوئی جز کٹ جائے تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح اگر اسلام کے دیگر اعمال میں سے بعضے چھوٹ بھی جائیں تو انسان مؤمن تو باقی رہتا ہے اگرچہ بعضے گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے فاسق اور گناہگار شمار ہوگا؛ لیکن اگر اصولی عقائد میں سے کوئی بھی عقیدہ ختم ہو جائے یا اس میں فساد پایا جائے تو ایمان ختم ہو جاتا ہے اور انسان دائرۂ اسلام سے نکل کر کافر ہو جاتا ہے۔ ان شاء اللہ تحریر کے اگلے حصوں میں اہل السنہ والجماعہ کے عقائد کی تفصیلات ذکر کی جائیں گی۔

لفظِ ''عقیدہ'' کی لغوی تحقیق اور کچھ استعمالات:

''عقیدۃ'' عربی زبان کا لفظ ہے، اس کی جمع عَقَائِدُ ہے۔ یہ ''عَقْدٌ'' سے نکلا ہے۔ عربی میں کہا جاتا ہے عَقَدَ الْحَبْلَ يَعْقِدُ عَقْداً۔ جس کے معنی ہیں ''گرہ لگانا''۔ کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنے کو بھی عقد کہتے ہیں، اسی طرح کسی بات کو پورے یقین کے ساتھ مان لینے کو بھی عقد کہتے ہیں۔

عقد کی جمع عُقود ہے جس کے معنیٰ ہیں ''معاملہ''(Deal)۔یہیں سے عقد بیع اور عقد نکاح جیسے الفاظ نکلتے ہیں۔چناں چہ آپس میں نکاح کرنے والے زوجین کے لئے عاقدین کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اسی طرح کسی جانور کو رسی سے باندھا گیا ہو اور وہ نر ہو تو اسے مَعقودٌ کہتے ہیں اور اگر وہ مادہ ہو تو معقودۃٌ کہا جاتا ہے۔عقیدہ کا لفظ عربی قواعد کی رو سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے''مَعْقُوْدَۃٌ'' کے معنیٰ میں،یعنی باندھی ہوئی چیز۔اسی بنیاد پر دل میں جمائے ہوئے یقین اور اعتقاد کو''عَقِیْدَۃٌ'' کہتے ہیں۔

عقیدہ کی اصطلاحی تعریف:

شریعت کی اصطلاح میں عقیدہ ایسی بات اور ایسے حکم کو کہتے ہیں،جس کے تعلق سے دل بے چوں وچرا مان لے کہ یہ سچ اور برحق ہے اور اس پر عمل ضروری ہے۔اور اُس بات پر اس قدر شرحِ صدر ہو جائے کہ اس کے بارے میں کسی بھی قسم کے شک اور کسی بھی قسم کے تردّد کی کوئی گنجائش نہ رہے

ایک مثال:

اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ''اللہ تعالیٰ تن تنہا ہیں''ایک اکیلے ہیں،ان کا کوئی دوسرا نہیں،اللہ کے بارے میں ہمارا یہ تصور ذہن میں اور دل میں رچا بسا ہوا ہے گو یا ذہن و دل میں باندھ دیا گیا ہے کہ اللہ اکیلے ہیں اور کوئی ان کا دوسرا نہیں ہے۔ذہن و دماغ اور دل میں جمی ہوئی اسی طرح کی بات کو کہتے ہیں عقیدہ۔

پتہ یہ چلا کہ اللہ پاک کی ہستی کے حوالہ سے،محبوب علیہ السلام کی ذات کے تعلق سے اور آخرت کے بارے میں اور اسی طرح ان تینوں بنیادی عقائد کے گرد گھومنے والے مزید جتنے بھی عقیدے ہیں،ان سب کو دل سے ماننا اور بے شک وشبہ یقین کامل رکھنا ہی ایمان ہے اور عقائد میں اسی کی تفصیلات مذکور ہوتی ہیں۔(جاری)

☆☆☆

اَکابر شناسی

چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

از: ابوسیّد محمد اللہ غوری

پچھلی صدی میں ایک بزرگ ہستی گذری ہے، جن کا نام نامی اشرف علی ہے، سہارنپور کے قریب تھانہ بھون قصبہ کی رہنے والی، فضل وکمال میں اپنی مثال آپ، قریب ایک ہزار کتابوں کے مصنف، یکتائے روزگار علماء اور دانایانِ عصر کے پیشوا، رہبر اور مرشد! علمی کمالات میں تو اپنے اقران و امثال میں ممتاز تھے ہی، سلوک ومعرفت اور تصوف وطریقت کے بھی مجدد تھے۔ اہل علم اور طبقۂ خواص میں مرجعیت کے ساتھ ساتھ اربابِ دولت ومملکت اور والیانِ ریاست بھی آپ سے نیازمندانہ شرفِ تعلق رکھتے تھے اور گاہے گاہے اپنے ہاں تشریف آوری کی درخواست بھی کرتے تھے۔ درخواستیں مخلصانہ ہوتیں، دعوت نامے خود داعیان کے لئے باعثِ عز وشرف ہوتے؛ لیکن مدعو ہستی خود دار، غیرت منداور مستغنی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کی عظیم مصلح بھی تھی۔ ان کے ہر کام میں اصلاحی رنگ نمایاں ہوتا تھا۔

چنانچہ مذکور ہے کہ ایک دفعہ ڈھاکہ (بنگلہ دیش) کے مشہور ومعروف نواب، سلیم اللہ خاں نے (جن کی دعوت کے وائسرائے اور گورنر مشتاق رہتے تھے اور بے شرط ان کی دعوت کو قبول کر لیتے تھے) حضرت کو بہ تمام اشتیاق مدعو کیا، ان کی اس نیازمندانہ درخواست کو شرف قبولیت ملی؛ لیکن ان کی امارت ووجاہت کے پیش نظر چند شرائط کے ساتھ۔

وہ شرائط ذرا ملاحظہ فرمائیں:

(۱) کسی قسم کا نقد یا غیر نقد ہدیہ نہ دیا جائے۔

(۲) کسی خاص مضمون پر وعظ کہنے کی فرمائش نہ کی جائے۔

(۳) قیام کا انتظام ایوانِ خاص سے جدا ایسی جگہ ہو جہاں عام مسلمان بے تکلف آجا سکیں۔

(۴) خود اپنی ملاقات کے لیے کوئی خاص وقت متعین کرلیں، جس میں کوئی اور شخص شریک نہ ہو؛ تاکہ جانبین سے افادہ واستفادہ آسان ہوسکے۔

سبحان اللہ! کیسی کیسی باریکیاں ہیں اور کتنی دور اندیشی ہے، امراء وارباب ِدولت اور اصحابِ منصب کی جو نفسیات ہوتی ہیں ان کے پیش نظر کیسی حکیمانہ شرائط ہیں، جن کی رعایت اور پاسداری سے ہی خود بہ خود نفسِ امارہ پرضرب پڑتی ہے۔ اور داعی کی سچی طلب اور جذبۂ اصلاحِ نفس کا اندازہ وامتحان بھی خوب خوب ہوجاتا ہے۔ پھر ان شرائط میں غور طلب بات یہ بھی ہے کہ نہ کہیں اسلوب تحقیر کا ہے، نہ انداز استہزاء کا؛ بلکہ ایک والیٔ ریاست کی وجاہت وحیثیت کا مکمل پاس ولحاظ! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے ہی حکیمانہ طرزِ اصلاح کے نمونے دیکھ دیکھ کر ادیب شہیر مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ جیسے معقولی اور فلسفی فدویت کے ساتھ بے اختیار یہ کہہ پڑے۔

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات کچھ اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

آگے لکھا ہے کہ وہ نواب صاحب بھی بڑے سمجھدار تھے، سلیم الفطرت اور اسم بامسمی! شرائط کو پڑھ کر ان کی حکمت وندرت اور صحت ومصلحت پر عش عش کر اٹھے، اور غلبۂ اشتیاق میں بے چوں وچرا سب شرطیں منظور کرلیں۔ (سیرت اشرف، ص:۱۳۹، ۱۴۰)

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ بھی ہے، جس میں ہم خوردوں اور نام لیواؤں کے لئے کئی اسباق ہیں۔ واقعہ طویل سہی؛ لیکن درس وعبرت اور پند ونصیحت کے گراں مایہ ملفوظات پر مشتمل ہے، چناں چہ اس کو مدنظر رکھ کر آگے بڑھیں۔

خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھ کو حیدرآباد دکن میں ایک دوست نے مدعو کیا تھا۔ دیوبند کے بعض احبابِ خاص اہل علم نے مشورہ دیا کہ وہاں نواب صاحب سے ملاقات ضروری ہے۔ میں نے کسی کو کوئی جواب نہ دیا، وہاں پہونچ کر سات ہی روز گزرے تھے کہ فلاں نواز جنگ کا پرچہ آیا جس میں لکھا تھا کہ عرصہ سے مجھ کو زیارت کا اشتیاق تھا؛ مگر بدقسمتی سے تھانہ بھون کی حاضری نصیب نہ ہوئی، برائے زیارت حاضر ہونا چاہتا ہوں، فلاں فلاں وقت اپنے فرائضِ منصبی سے فرصت ملتی ہے۔ یہ

صاحب اس وقت ارکانِ سلطنت میں سے تھے اور نواب حیدرآباد کے مقرب۔ حضرت نے انہیں جواب لکھا: بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے دل میں دین اور اہلِ دین کی وقعت وعظمت ہے؛ مگر نیچے کی سطر پڑھ کر افسوس کی بھی کوئی حد نہ رہی کہ اس میں فہم سے کام نہ لیا گیا۔ جس کے ملنے کو زیارت سے تعبیر کیا گیا اس کو تو اپنے اوقاتِ فرصت بتلا کر پابند کیا گیا اور خود آزاد رہے۔ یہ کونسی فہم اور تہذیب کی بات ہے۔

اس پر نواز جنگ صاحب نے اپنی بدفہمی کی معافی چاہی اور لکھا کہ حضرت والا ہی اپنی ملاقات کے اوقات تحریر فرمادیں۔ سبحان اللہ! ایک ہی تحریر اور اس میں اس درجہ کی اصلاح۔ لیکن اصلاح کرنے والی ہستی بھی حضرت تھانوی کی تھی، جو سلوک وتصوف اور اصلاح وتربیت کے میدان میں بہ اتفاقِ ائمہ ٔفن اپنے دور میں مجدد تھے۔ ان کے ہاں انسانیت سکھائی جاتی تھی اور اسی پر سارا زور صرف ہوتا تھا۔ خود ہی ارشاد فرماتے تھے کہ ''جس کو بزرگ بننا ہو وہ کہیں اور جائے، ہاں! انسان بننا ہے تو ان کے یہاں آئے۔''

چناں چہ اب کی بار لکھا کہ اب بھی پورے فہم سے کام نہیں لیا گیا، مردہ بدستِ زندہ کی طرح مہمان میزبان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس لئے سفر میں اوقات کا ضبط ہونا غیر اختیاری ہے، آپ ساتھ رہیں جس وقت مجھ کو فارغ دیکھیں ملاقات کرلیں۔ کہتے ہیں کہ حضراتِ اہلِ دل اور اولیائے کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فہمِ دین کی خصوصی نعمت سے نوازا جاتا ہے، کہنا چاہیے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اندازِ اصلاح وتربیت، باریک بینی اور نفسیات شناسی اسی ''خصوصی فہم دین'' کی ایک مثال ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس جوابی خط پر اُن صاحب نے دوبارہ معافی چاہی اور کہا کہ بدفہمی پر بدفہمی ہوتی چلی جارہی ہے۔ میں نہ اب اپنے اوقات کو ظاہر کرتا ہوں اور نہ حضرت سے معلوم کرتا ہوں۔ جس وقت فرصت ہوگی، حاضرِ خدمت ہوکر زیارت سے مشرف ہوجاؤں گا؛ اگر فرصت نہ ہوئی تو لوٹ آؤں گا۔ واہ! کیسی مصلحانہ شان ہے اور اصلاح بھی کس شخص کی کی جارہی ہے؟ نوابِ دکن کے مقرب کی اور سلطنت کے عظیم رکن کی۔ اب کی بار حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو جواب تھا، اس میں مخاطب کی خوش اخلاقی کا اعتراف بھی ہے اور سچے طالبین کی قدردانی بھی۔ ارشاد فرمایا کہ: اب پورے فہم

سے کام لیا گیا ہے جس سے اس قدر مسرت ہوئی کہ پہلے آپ کا میری زیارت کو جی چاہ رہا تھا، اب میرا آپ کی زیارت کو جی چاہنے لگا۔ اگر فرصت ہو تو آپ تشریف لے آئیں؛ ورنہ مجھ کو اجازت فرمایئے، خود حاضر ہو جاؤں گا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس طرز کی آخر وجہ کیا تھی؟ اس کی علت بھی حضرت نے ہی اپنی ایک مجلس میں بیان فرمائی، جو واقعی ہم ایسوں کے لئے چشم کشا اور بصیرت افروز ہے۔ خود حضرت ہی کے الفاظ میں پڑھیں۔ فرماتے ہیں کہ ''میرا یہ طرزِ عمل اس لیے تھا کہ یہ دنیا کے جس قدر بڑے لوگ ہیں، اہل دین کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ ان کو یہ دکھلانا تھا کہ اہل علم و دین کی یہ شان ہے کہ پہلے تو تذلُّل سے بچنا مقصود تھا، مگر جب وہ اپنی کوتاہی تسلیم کر چکے تو اب کھنچنا تکبر تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ دونوں سے محفوظ رکھا۔''

پھر وہ نواز جنگ صاحب آئے اور بصد عجز و نیاز آئے۔ حضرت نے از راہِ شفقت ان کو اپنے ساتھ بیٹھنے کے لئے بھی کہا، لیکن انہوں نے بہ اصرار کہا کہ مجھ کو یہیں (سامنے ہی) آرام ملے گا۔ دورانِ گفتگو اُن صاحب نے نواب حیدر آباد (دکن) سے ملاقات کے سلسلے میں درخواست پیش کی۔ اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو جواب دیا، وہ بھی ہم ایسوں کے لیے بصیرت انگیز ہے۔ ''دریافت فرمایا کہ یہ آپ کی خواہش ہے یا نواب صاحب کی؟ قدرے سکوت کے بعد انہوں نے عرض کیا کہ میری خواہش ہے۔ ارشاد ہوا کہ جس وقت آپ نے ملاقات کے مناسب و نامناسب ہونے پر غور فرمایا ہوگا اس پر بھی غور فرمایا ہوگا کہ ملاقات سے نفع کس کا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ نواب صاحب کا۔ ارشاد فرمایا کہ نفع نواب صاحب کا اور ملاقات کی ترغیب مجھ کو دی جا رہی ہے۔ (گویا) طالب کو مطلوب اور مطلوب کو طالب بنایا جا رہا ہے۔'' اس پر وہ صاحب چپ ہو گئے۔ پھر آگے حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ''اس صورت میں کہ میں خود ملاقات کو جاؤں مضرت ہی مضرت ہے، نفع کچھ نہیں۔ اگر ملاقات کو گیا تو وہ مطلوب اور میں طالب ہوں گا، تو اس صورت میں ان کو مجھ سے کچھ نفع نہیں ہوگا۔ ہاں ان سے مجھ کو نفع ہو سکتا ہے؛ اس لئے کہ جو چیز ان کے پاس ہے، وہ مجھے ملے گی یعنی دنیا۔ (اور) وہ بقدر ضرورت بحمد اللہ میرے پاس بھی ہے اور جو میرے پاس ہے، وہ بقدر ضرورت بھی ان کے پاس نہیں یعنی دین۔''

ان صاحب نے جب حضرت کی یہ باتیں سنیں تو آنکھیں کھل گئیں، کہنے لگے ان چیزوں پر تو ہماری نظر بھی نہیں پہونچ سکی۔(سیرت اشرف،ص:۲۴۶ تا ۲۴۸)

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

سچ ہے کہ یہ استغنائی مزاج، یہ جوہرِ خودداری وخود شناسی، یہ حفاظت عزت نفس اور یہ صفت غنائے قلب ان اعلی اوصاف اور پاکیزہ اقدار میں سے ہے، جو ہمارے اکابر واسلاف کے کارواں کی قیمتی متاع ہیں، جواب رفتہ رفتہ قصہ پارینہ بن رہے ہیں۔اور ان کی جگہ تملُّق ، چاپلوسی، خوشامدی، بے جا اور مبالغہ آمیز مدحت سرائی، امراء وارباب ِ مال وزر کی قصیدہ خوانی یا ان سے توقعات وامیدیں دَر آرہی ہیں، یقیناً یہ چیز حضراتِ علماءِ کرام اور طبقۂ خواص کے شایان شان نہیں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اکابر کا سچا وارث بنائے۔(آمین)

☆☆☆

تعارفِ کتبِ تصوف

تصوف وسلوک

کتاب کا نام : تصوف وسلوک

مولف : محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی قدس سرہ

تعداد صفحات : ۲۲۷

ناشر : مکتبۃ الفقیر ،فیصل آباد

تعارف نگار : مفتی محمد عمران کورٹلوی

انسان؛جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔جسم سے اگر روح پرواز کر جائے تو یہ ایک لاشئہ بے جان بن جاتا ہے،غیر متحرک وساکن!اور روحِ بے جسم بھی احکام شریعت کی مکلف نہیں۔چناں چہ جسم ہو کہ روح، دونوں کی اپنی اپنی اہمیت ہے اور اپنے اپنے تقاضے اور ضرورتیں۔جسم کو اگر غذا کی حاجت رہتی ہے تو روح بھی اس سے بے نیاز نہیں، بے احتیاطیوں کی وجہ سے جسم کو اگر مرض لاحق ہو جاسکتا ہے تو روح بھی بد پرہیزیوں کے سبب بیمار ہو جاتی ہے۔پھر جس طرح جسمِ ظاہری کے علاج معالجہ کے لئے اطباء ہوتے ہیں جو نبض شناسی سے امراض کی تشخیص کرتے اور مریض کے لئے دوائیں تجویز کرتے ہیں، بالکل یہی معاملہ روح کے ساتھ بھی ہے۔روحانی اطباء قلب سقیم (بیمار دل) کو باطنی آنکھوں سے دیکھ کر روح کی بیماریاں پہچان لیتے ہیں، پھر اُن روحانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔

یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ جس طرح بخار زدہ شخص کی زبان میٹھی چیز میں بھی کڑواہٹ محسوس کرتی ہے اور اسی وجہ سے ڈاکٹرز بیمار شخص کے لئے مقوّی غذاؤں سے پرہیز کو لازم قرار دیتے ہیں کہ معدہ اس کا متحمل نہیں ہوتا اور بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہی پہونچتا ہے، بالکل ایسے ہی جب روح بیمار ہو جائے تو روحانی غذاؤں (طاعات وعبادات) میں مزہ محسوس نہیں ہوتا۔تلاوت قرآن سے

جی اکتاتا ہے، نماز میں دل نہیں لگتا اور دعاؤں کے لئے ہاتھ بھی اٹھانا بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ لیکن جب ان روحانی بیماریوں (بے جا شہوت، بے موقع غصہ، حسد و کینہ، کبر و عجب، حرص و بخل وغیرہ) کا علاج ہوجاتا ہے تو پھر حرام چیزوں سے بچنے، فرائض کی پابندی کرنے کے ساتھ نوافل کی بھی توفیق ہوتی ہے۔ پھر رات کے آخری پہر میں مناجات کی لذت بھی نصیب ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ طبیعت شریعت کے مطابق ڈھلنے لگتی ہے۔ مختصر یہ کہ نفس پرستی سے خدا پرستی تک کا یہ تربیتی و اصلاحی سفر روحانی اطباء (جنہیں عرف عام میں اہل دل، اللہ والے، مشائخ اور مرشدین جیسے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) کے زیر سایہ اور زیر صحبت ہی طئے ہوتا ہے۔

چنانچہ روح کی بیماریاں کیا ہیں؟ اس کا علاج کیسے ہوتا ہے؟ معالج کون ہوتے ہیں؟ ان کی علامات کیا ہوتی ہیں؟ دوائیں اور طریقۂ استعمال کیا ہوتا ہے؟ دواخانہ کا نام کیا ہوتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ اہم موضوعات پر روحانی دنیا کے ایک طبیب حاذق، سالارِ قافلۂ اہل دل، محبوب العلماء والصلحاء، حضرت مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی قدّس اللہ سرّہ واعلی اللہ مراتبہٗ نے ایک ابتدائی کتاب "تصوف وسلوک" کے نام سے تالیف فرمائی، جو اپنے موضوع پر مختصر ہونے کے باوجود بہت جامع ہے۔

کتاب کل ۱۳/ ابواب پر مشتمل ہے، جس میں علم تصوف، تصوف کیا ہے؟ لفظ صوفی کی تحقیق، بیعتِ طریقت کا شرعی ثبوت، ضرورتِ مرشد، آدابِ مرشد، خانقاہوں کا قیام، اعتقادات، اسباقِ تصوف، بعض اکابرِ سلسلۂ نقشبندیہ کے معمولاتِ شب و روز اور معارف وحقائق جیسے گراں قدر اور اہم عنوانات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اخیر میں طریقت یا تصوف وسلوک کے حوالے سے عموماً کئے جانے والے چند سوالات کے جوابات بھی مذکور ہیں۔

اس کتاب کی خوبیوں میں یہ بھی ہے کہ زیر بحث موضوع کو دلائلِ قرآن وحدیث سے مدلّل و مُبرہَن کیا گیا ہے، مستند تفاسیر کے حوالے درج ہیں، اسلافِ امت کے اقوال سے بھی تائیدات پیش کی گئی ہیں اور ان سب سے سوا؛ کتاب میں زبان کی سلاست اور بیان کی ادبی چاشنی بھی قاری کے ذوق کو تسکین فراہم کرتی ہے۔ نیز موقع ومحل کی مناسبت سے اردو، عربی اور فارسی کے اشعار صاحب

کتاب کے اعلیٰ ادبی ذوق کے آئینہ دار ہیں اور اردو کے علاوہ فارسی اور عربی سے گہری دلچسپی اور انتہائی شغف کے ترجمان!

کتاب سے چند اہم اقتباسات پیش ہیں:

"علم تصوف" نامی باب کے تحت ایک ذیلی عنوان ہے "تصوف مشاہیر امت کی نظر میں" اس میں صفحہ ۲۳ و ۲۴ پر رقم طراز ہیں: "حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے: مَنْ تَفقَّهَ وَلَمْ يَتَصوَّفْ فَقَدْ تَفَسَّقَ وَمَنْ تَصوَّفَ وَلَمْ يَتَفقَّهْ فَقَدْ تَزَنْدَقَ وَمَنْ جَمَعَ بَيْنَهُمَا فَقَدْ تَحَقَّقَ

ترجمہ: ''جس نے (علمِ) فقہ حاصل کیا، مگر (علمِ) تصوف حاصل نہ کیا، اس نے فسق کیا۔ اور جس نے (علم) تصوف تو حاصل کیا، مگر (علم) فقہ حاصل نہ کیا وہ زندیق ہوا۔ اور جس نے ان دونوں (علوم) کو جمع کیا پس وہ محقق ہوا''

اسی طرح مشہور فقیہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل فرماتے ہیں: الطَّرِيقَةُ وَالشَّرِيعَةُ مُتَلَازِمَتَانِ

ترجمہ: طریقت وشریعت دونوں لازم وملزوم ہیں۔

پھر شریعت وطریقت کے حوالے سے مشہور شاعر حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کے اشعار یوں پیش کیے:

سنو دو ہی لفظوں میں مجھ سے یہ راز
شریعت وضو ہے، طریقت نماز

شریعت میں ہے صورتِ فتحِ بدر
طریقت میں ہے معنیٔ شقِ صدر

شریعت میں ہے قیل وقال حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
طریقت میں حسن و جمال حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نبوت کے اندر ہیں دونوں ہی رنگ
عبث ہے یہ صوفی و ملا کی جنگ

پھر آگے لکھتے ہیں: "پس ثابت ہوا کہ علم تصوف کوئی عجمی چیز نہیں، بلکہ خالص مکی اور مدنی چیز ہے۔ البتہ جاہل صوفیا کی وہ باتیں جو کتاب وسنت کے خلاف ہوں ہمیشہ رد کی جائیں گی"۔

اسی طرح صفحہ ۳۸/ پر "صوفی کون ہوتا ہے؟" کہہ کر سوالیہ اسلوب میں ایک ذیلی عنوان قائم کر کے اکابر صوفیاء کرام کے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں۔ ان میں سے چند ملاحظہ ہوں:

"حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد عبدالواحد بن زید رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ صوفیاء کون ہوتے ہیں؟ فرمایا: جو اپنی عقلوں کے ذریعے اپنے ارادوں پر قائم ہوتے ہیں اور اپنے دلوں سے اس پر ڈٹے رہتے ہیں اور اپنے شر سے بچنے کی خاطر اپنے آقا کو مضبوط پکڑے رہتے ہیں۔"

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "صوفی وہ ہے جسے جستجو تھکا نہ سکے اور محرومیت کی وجہ سے بے چین نہ ہو"۔

حضرت ابومحمد رویم رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا تو ارشاد فرمایا: "جس کا کردار اس کی گفتار کے موافق ہو"۔

مشہور صوفی بزرگ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "صوفی وہ ہے جو مخلوق سے کٹے اور اللہ سے جڑے۔"

ان اقوال کے نقل کرنے کے بعد مؤلف کتاب حضرت قدس سرہ کے مخصوص ادبی اسلوب میں صوفی کی تعریف ملاحظہ ہو۔ خلاصۂ کلام کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں: "پس صوفی وہ ہوتا ہے جس کو جانوروں کی آواز، ہر ایک سوز وساز، چڑیوں کی چہک، پھولوں کی مہک، سبزے کی لہک، جواہرات کی دمک، سورج کی چمک، سماء وسمک، درختوں کے رنگ، شیشہ وسنگ، پتھر کی سختی، خوشحالی وبدبختی، زمین کی نرمی، آتش کی گرمی، دریا کی روانی، کواکب آسمانی، پہاڑوں کے ابھار، بیابان ومرغزار، خزاں وبہار، غرض ہر چیز ایک نادیدہ ہستی کی یاد دلائے "اللہ اللہ اللہ"۔

ایک جگہ شریعت وطریقت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سرتاجِ نقشبند حضرت امام

ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات شریفہ سے درج ذیل اہم قتباسات نقل فرمائے:

(۱) کُلُّ طَرِیقَۃٍ رَدَّتْہُ الشَّرِیعَۃُ فَھُوَ زَنْدَقَۃٌ وَاِلْحَادٌ

ترجمہ: طریقت کی ہر وہ بات جسے شریعت رد کرے زندقہ اور کفر ہے۔"

(۲) "ہمارے مشائخ شرع شریف کے نفیس موتیوں کو بچوں کے مانند وجد وحال کے جوز ومویز کے بدلے نہیں دیتے، نص سے فص کی طرف مائل نہیں ہوتے، فتوحات مدنیہ سے فتوحات مکیہ کی طرف التفات نہیں کرتے۔ ان کا کارخانہ بلند ہے"۔

(۳) وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو تقلید سنت سے الگ ہوکر اختیار کیے جائیں، معتبر نہیں ہیں۔ اس لیے کہ جوگی اور ہندوستان کے براہمہ اور یونان کے فلاسفہ بھی ان کو اختیار کرتے ہیں اور یہ ریاضتیں ان کی گمراہی میں اضافہ کے سوا اور کچھ نہیں کرتی ہیں۔ (جلد اول مکتوب دوصد وبیست ویکم)

غرض پوری کتاب تصوف وسلوک کے بارے میں قیمتی، اہم، منتخب اور خوب صورت تعلیمات سے آراستہ ہے اور صفحہ صفحہ مؤلف کتاب کے وسیع مطالعے، حسن انتخاب اور نفیس طرزِ تعبیر وپیش کش کا گواہ ہے۔

لائق ذکر ہے کہ یہ کتاب؛ ہندو بیرون ہند کے متعدد کتب خانوں سے طبع ہو چکی ہے اور ایک دنیا اس سے بفضل خدا استفادہ کر چکی ہے۔ (الحمدللہ)

بڑی بات یہ بھی ہے کہ مؤلف نے یہ کتاب سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کی اشاعت کے لئے ہونے والے پے در پے تبلیغی اسفار کے دوران سپرد قرطاس کی۔ (جیسا کہ پیش لفظ میں اس کی صراحت ہے)۔ یہ واقعی بڑی جدوجہد اور انتہائی عزیمت کی بات ہے کہ آدمی اسفار میں بھی (جہاں شریعت نے نماز وروزہ جیسی اہم عبادت میں بھی تخفیف کردی ہے) لکھنے کا مشغلہ جاری رکھے اور پھر تبلیغی اسفار میں تو بیانات ومواعظ کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، ایسے میں قرطاس وقلم کی وادی میں رہ نوردی کرنا؛ یقیناً لکھنے والے کے باتوفیق اور اولُو العزم ہونے کی علامت ہے!!

ضرورت ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ، روحانی دنیا کے کسی معتبر راہنما کی رہبری میں کیا جائے اور علم کی روشنی میں، حقائق سے آگاہی کے ساتھ راہ ولایت اور راہ محبت کی منزلیں طئے کی جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام کے لئے آسان فرمائے۔ (آمین)

خطوط ہائے راہِ معرفت

درسِ قصدُ السبیل

(قسط اوّل)

ماضی قریب میں حکیم الامت مجدد الملّت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایسی رہی کہ حضرتؒ کی اصلاحی خدمات اور مجددانہ و مجتہدانہ کارناموں سے سبھی واقف و آگاہ ہیں، عوام وخواص کی اصلاح و تربیت اور تزکیۂ نفس وتصفیۂ قلب کا اصولی نظام سبھی پر ظاہر و باہر ہے، صرف یہی نہیں؛ بلکہ آپ نے راہِ تصوف وسلوک میں درآئی بدعات و رسومات کو ختم کرکے اس راہ کے حقیقی مقاصد و آداب سے امت کو واقف کروایا، چناں چہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ بہ نام ''قصد السبیل الی المولی الجمیل'' تحریر فرمایا، جس میں اپنے زمانہ کی عام فہم زبان میں ایک سالک کو سلوک سمجھایا تھا کہ اگر کوئی تصوف وسلوک کے راستہ میں قدم رکھنا چاہے اور کسی شیخِ کامل سے رجوع ہوکر اصلاح و تربیت کروانا چاہے تو اُسے کن چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے؟

اُستاذ محترم محسن و مربی ترجمانِ اہل السنۃ والجماعۃ انتہائی بافیض و مستندترین بزرگ حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب مدظلہ العالی جو بالواسطہ سلسلۂ تھانویہ کے مایہ ناز فرد اور حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ذوق و مشرب کے بہترین شارح و ترجمان ہیں، آپ نے حضرت والا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مختلف رسالوں و کتابچوں کی بہت ہی سہل و عام فہم تشریح و توضیح کرکے افادۂ عام کی غرض سے انہیں طبع کروایا ہے، انہی میں ایک یہ مذکورہ بالا رسالہ بھی ہے۔ تفصیلی مضامین آپ آگے ملاحظہ فرمائیں گے ان شاء اللہ۔

اس عاجز نے اپنی ماہانہ مجالس نیز ماہِ رمضان المبارک میں بموقع اعتکاف، سالکین کے عمومی فائدے کے پیشِ نظر مذکورہ رسالے میں سے ہدایات و تعلیمات کو قدرے مزید شرح و وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی، احباب نے اُسے محفوظ کرکے قلم بند کیا اور اب اسے ماہنامے میں قسط وار پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ افادہ مزید عام ہو۔ اللہ پاک کوتاہیوں سے درگزر فرماتے ہوئے اسے سب کے حق میں نافع و مفید بنائیں آمین۔ (مفتی احمد اللہ غوری نقشبندی مجدّدی)

پہلی ہدایت: سلوک کی تعریف اور ذرائع

سلوک: جس کو عرف میں تصوف کہتے ہیں۔ اپنے ظاہر و باطن کو شریعت اور سنت سے آراستہ کرنے کا نام ہے اور اس کے دو درجے ہیں۔

(۱) ظاہر کو فرائض اور حقوق واجبہ کی تعمیل سے اور باطن کو سچے عقیدوں اور اچھی صفتوں سے آراستہ کرنا؛ یہ سلوک کا ادنی درجہ ہے، جس کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہے، اس کے حصول کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔

(الف) بہ قدرِ ضرورت علمِ دین حاصل کرنا خواہ کتابیں پڑھ کر یا عالموں سے پوچھ پوچھ کر۔ جس زبان میں آسانی سے سمجھ سکتے ہوں اسی زبان میں اتنا علم حاصل کرلیں۔

(ب) علم پر عمل کرنے کی ہمّت اور پختہ ارادہ رکھنا تاکہ نفسانی تقاضے اور لوگوں کے اعتراضات عمل میں رکاوٹ نہ بنیں۔ سلوک کا یہ درجہ فرض عین ہے۔

(۲) ظاہر کو فرائض و واجبات کے علاوہ سنن ونوافل سے بھی آراستہ کرنا، اور باطن کو سچے عقیدوں اور اچھی صفتوں سے آراستہ کرنے کے علاوہ ہر وقت یادِ الٰہی میں مشغول رکھنا۔

سلوک کا یہ درجہ مندوب و مستحب ہے؛ لیکن عام طور سے لوگ اسی کو سلوک اور تصوف سمجھتے ہیں۔ اگرچہ سلوک کا یہ مرتبہ اعلیٰ مرتبہ ہے؛ مگر اس میں مشغول ہونے کی وجہ سے اگر پہلا درجہ (یعنی ظاہر کو فرائض و واجبات سے اور باطن کو صفاتِ حمیدہ سے آراستہ کرنا) متأثر ہوتا ہے تو پھر شرعاً اس دوسرے درجے میں مشغول ہونا ممنوع ہو جائے گا، جیسے بعض لوگ ہیں کہ بیوی بچوں کے حقوق تلف کر کے ذکر و شغل میں لگے رہنے کا نام طریقت و بزرگی سمجھ بیٹھے ہیں، جو کہ صحیح نہیں ہے؛ ہاں! پہلے درجے کی تکمیل کے ساتھ یا اس کے بعد اس دوسرے درجے تک بھی پہنچ جائے تو یقیناً یہ بڑی فضیلت اور بزرگی کی بات ہے۔

تشریح وتوضیح

کتاب کا نام ہے "قصد السبیل الی المولی الجمیل" یعنی وہ راستہ جو اللہ تک جاتا ہے اور جس راستہ پر چل کر اللہ تعالیٰ کی محبت و معرفت نصیب ہوتی ہے، اس راستہ (پر چلنے) کا ارادہ کرنا۔

ارادہ کرنے کے بعد اس راہ کے اُصول و آداب سے واقف ہونا اور ضروری باتوں کو جاننا؛ تاکہ عمل کرنے میں آسانی ہو سکے۔

وجہِ تالیف

اس کتابچے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے سالکینِ طریقت کے لئے جملہ گیارہ ہدایات تحریر فرمائی ہیں جن کا لحاظ رکھنا ہر سالک و طالبِ راہِ معرفت ومحبت کے لیے لازم وضروری ہے، اور ان ہدایات کے بیان کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ بہت سارے لوگوں کو سلوک وتصوف کا شوق تو ہوتا ہے؛ لیکن اس راہ کے مقاصد اور آداب سے ناواقف ہونے کی وجہ سے طرح طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ غلطیوں میں تو مبتلا نہیں ہوتے؛ لیکن غیر مقصود چیز کو مقصود سمجھ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، اور اصل مقصود (اپنی اصلاح وتربیت) سے غافل ہو جاتے ہیں، چنانچہ محض ذکر واذکار اور وظائف کی طرف تو متوجہ ہوتے ہیں مگر اصل مقصود (تزکیۂ نفس) سے صرفِ نظر کر جاتے ہیں، جب کہ تاوقتے کہ نفس نفسانیت سے باز نہ آجائے قلب میں انوارات کو جذب کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، پھر انجامِ کار راہِ سلوک میں چلتے ہوئے بھی سلوک طے ہی نہیں کر رہے ہوتے ہیں: جیسے سواری پر بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ سواری چل ہی نہیں رہی ہے۔ اس لیے سلوک کا مقصد اور اس کے متعلقات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

سلوک کی تعریف

پہلی ہدایت میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سلوک کی تعریف، اس کے درجات اور اس پر چلنے کے طریقے تحریر فرمائے ہیں: چناں چہ سلوک بمعنی طریق ہے، جس کو تصوف بھی کہتے ہیں، اس کا ماحصل بس یہ ہے کہ ظاہر وباطن شریعت وسنت سے سنور جائے۔

بن جائے یہ سب قال مرا حال سراسر
جو کچھ ہے زباں پر ہو خدایا میرے دل میں

یہ سلوک کا خلاصہ ہے۔

راہِ سلوک میں ظاہر و باطن کا یکساں ہونا ضروری ہے، اندر ایک اور باہر ایک یعنی نفاق والی زندگی

سلوک کے خلاف ہوتی ہے، سالک منافق نہیں ہوسکتا اور منافق سالک نہیں، جیسا ظاہر ویسا باطن، اور جیسا باطن ویسا ظاہر ہونا چاہیے۔ اسی کا نام سلوک اور تصوف ہے، اسی کے لیے ساری محنت کی جاتی ہے۔

البتہ سلوک کی ابتدا اور انتہا کو حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے دو حدیثوں کی روشنی میں اس طرح سمجھایا کہ سلوک وتصوف کی ابتدا ہے إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (نیتوں کی درستی سے اعمال پر ثواب وقبول مرتب ہوتے ہیں) اور انتہا ہے أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ (اللہ کی بندگی ایسے کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر یہ احساس پیدا نہیں ہو رہا ہے تو کم از کم یہ ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ (تصوف وسلوک، ص: ۱۲)

سلوک کا پہلا درجہ

بہت ساری چیزوں میں عمدگی اور بہتری کے اعتبار سے مختلف درجات اور مراتب ہوتے ہیں؛ چناں چہ سلوک کے بھی درجات ہیں، اس کا پہلا اور فرض درجہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے جن امور کو فرض وواجب قرار دیا ہے اُنہیں ادا کرنا خواہ وہ ظاہر سے متعلق ہوں یا باطن سے، ظاہر کا مطلب انسان کا جسم اور باطن سے مراد انسان کی روح ہے۔

جسمِ انسانی جن فرائض (مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج) کا مکلف ہے ان کو ادا کرنا اور حقوقِ واجبہ کی تعمیل کا مطلب یہ ہے کہ جتنے حقوق انسان کے ذمہ ضروری اور واجب الادا ہیں، چاہے وہ حقوق اللہ کی قبیل سے ہوں یا حقوق العباد سے متعلق، اُن کی ادائیگی کی حتی الوسع کوشش کرنا۔ اگر اس میں کوتاہی کرے گا تو اللہ کے یہاں پوچھ ہوگی، جیسے والدین اور بیوی بچوں نیز ماتحتوں کے حقوق کا بجالانا ہے۔ البتہ جن حقوق کا تعلق وجوب سے نہیں وہ حقوقِ نافلہ کہلاتے ہیں۔ یعنی اُن کو ادا کرے تو بہت اچھی بات ہے اور اگر نہ کرے تو مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ ان باتوں کا تعلق ظاہر سے ہے۔

باطن سے متعلق امور میں جیسے اپنے آپ کو سچے عقیدوں اور اچھی صفات سے سنوارنا ہے، سچے عقیدوں کا مطلب یہ ہے کہ گمراہ عقیدوں سے خود کو دور رکھے؛ جیسے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا غلط اور باطل عقیدہ ہے، اور سچا عقیدہ جیسے اللہ کو ایک اکیلا یکتا ماننا، ذات میں بھی اور صفات میں بھی، یہ سچے عقیدہ کی ایک مثال ہے۔ اچھی صفت سے متصف ہونا جیسے متواضع ہونا، متکبر نہ ہونا۔ اور اچھی

صفتوں کو مکمل طور پر حاصل کرنے کے لیے راہِ سلوک میں اپنے آپ کو لگانا اور کھپانا ہی سلوک کی بنیاد ہے، البتہ یہ سلوک کا وہ درجہ ہے جو فرض ہے، اس کو اختیار کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، جب اختیار کرنا فرض ہے تو اس کو سیکھنا بھی فرض ہے۔

ذرائع اور وسائل

اس کے سیکھنے کے دو ذریعے ہیں:

(الف) بقدرِ ضرورت علمِ دین سے مراد فرائض و واجبات کا علم (جن پر عمل بہر حال لازم ہے) خواہ کتابیں پڑھ کر سیکھیں یا علماء سے پوچھ پوچھ کر۔ انٹرنیٹ اور گوگل کے ذریعے نہیں، گوگل عالم اور مفتی نہیں ہے، گوگل شریعت نہیں ہے۔

(ب) دوسرا یہ کہ علم پر عمل کرنے کی پوری نیت اور ہمت رکھنا اور اس میں نفس کی باتوں اور شیطان کی چالوں میں نہ پڑ جانا اور لوگوں کے اعتراضات کی پرواہ نہ کرنا ضروری ہے، سلوک کا یہ درجہ ہر مسلمان پر فرض عین ہے، باپ پر اس کے اعتبار سے فرض ہے، بیٹے پر اس کے اعتبار سے فرض ہے؛ جیسے نماز ہر ایک پر مستقل فرض ہے۔

سلوک کا دوسرا درجہ

سالک کو چاہیے کہ اپنے ظاہر کو فرائض و واجبات کی ادائیگی کا پابند رکھنے کے علاوہ سنن و نوافل کا بھی اہتمام کرے؛ جیسے ظہر کی چار رکعت فرض پڑھنا یہ سلوک کا پہلا اور فرض درجہ ہے، اور ظہر سے پہلے کی چار رکعت سنتیں پڑھنا اور ظہر کے بعد کی دو رکعت سنت اور نفل پڑھنا یہ سلوک کا دوسرا اور اعلیٰ درجہ ہے، مگر یہ نفل کہلاتا ہے۔ نیز باطن کو سچے عقیدوں اور اچھی صفات سے آراستہ کرنے کے علاوہ ہر وقت یادِ الٰہی میں اپنے آپ کو مشغول رکھنا (جس کو حدیث میں مرتبۂ احسان کہا گیا) یہ بھی سلوک کا دوسرا اور اعلیٰ درجہ ہے جو نفل و مستحب کہلاتا ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ

سلوک کے اس دوسرے درجے کے تعلق سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”عام طور سے لوگ اسی کو سلوک و تصوف سمجھتے ہیں“۔ یعنی سنن و نوافل والے بن جائیں، ہمیشہ ذکر کرنے والے

بن جائیں وغیرہ۔اور فرائض وواجبات کا اللہ ہی حافظ!ایسے ہی سچے عقیدوں اور اچھی صفات کی کوئی فکر ہی نہیں ہوتی، مگر ہمیشہ یادِالٰہی کا غلبہ سوار رہتا ہے۔اس کی مثال: جیسے کوئی آدمی اول درجے کا متکبر ہے، مگر مراقبے پر مراقبہ کرتا ہے یا ایسے ہی بڑا حاسد ہے اور تہجد پر تہجد پڑھتا ہے تو یہ شخص سنن ونوافل سے تو آراستہ ہے اور یادِالٰہی میں بھی بے شک مشغول ہے؛ لیکن سلوک کے فرضِ عین والے درجہ سے محروم ہے، اکثر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں الا ماشاء اللہ۔

پس فرائض وواجبات اگر متأثر ہوتے ہیں یا کوئی شخص فرائض وواجبات کو ہلکا جان کر ترک کر دیتا ہے اور دوسرے درجے میں مشغول ہوتا ہے تو اسے اس سے روکا جائے گا، اور کہا جائے گا کہ آپ یہ کوئی اچھا کام نہیں کر رہے ہو؛ جیسے بعض لوگ بیوی بچوں کے حقوق ضائع کرتے ہیں اور ذکر و شغل میں لگے رہنے کو طریقت و بزرگی سمجھتے ہیں؛ حالاں کہ شرعاً یہ بات درست نہیں ہے۔

ادائے حقوق کے سلسلے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ:

ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ کی مسجد میں نمازِ فجر کی سنتوں میں مشغول تھے کہ دھڑام سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی، اطلاع ملی کہ بڑی پیرانی صاحبہ چھت سے گر پڑیں، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً نماز کی نیت توڑی، اور گھر تشریف لے جا کر تیمارداری فرمائی، پھر جب سب ضروری انتظامات سے فارغ ہو چکے تو واپس تشریف لا کر نمازِ فجر ادا کی۔سبحان اللہ! کیا ادائے حقوق اور حفظِ حدود ہے؛ ورنہ زاہدانِ خشک تو نماز تو درکنار ایسے مواقع پر وظیفہ بھی چھوڑنا خلافِ زہد سمجھتے ہیں جو سراسر حدودِ شرعیہ سے تجاوز ہے۔(اشرف السوانح: ج/ ۳، ص ۱۶۸) چونکہ اس وقت نماز توڑ کر گھر جانا ہی نیکی کا اعلیٰ درجہ تھا، اب لوگ ایسی حالت میں نماز توڑنا غلط سمجھتے ہیں اور بزرگی یہ سمجھتے ہیں کہ پتہ بھی نہ چلے کہ کیا چیز گری ہے؟ پتہ بھی نہ چلے کہ کیا مسئلہ ہوا ہے؟ یہ سنت نہیں ہے۔ہم نے کئی مواقع پر ہمارے حضرت جی قدس سرہ کو دیکھا کہ اپنے اہل وعیال کے حقوق واجبہ ہی نہیں نافلہ کو لے کر کیسی فکریں فرمایا کرتے تھے! ایک دو نہیں کئی واقعات ہیں جو ذہن کے پردے پر محفوظ ہیں۔

سنت معتبر ہے نہ کہ حال

کتابوں میں جو واقعات ملتے ہیں کہ دورانِ نماز بچہ کے اوپر سانپ گر گیا تو پتہ بھی نہیں چلا یا

اثنائے نماز تیر نکال لیا گیا پتہ بھی نہیں چلا، تو اس حوالے سے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ احوال ہیں، سنت نہیں ہیں، حال، دلیل نہیں ہے، سنت دلیل ہے، اور سنت یہ ہے کہ بچہ کے رونے کی آواز آئی تو نبی علیہ السلام نے نماز مختصر کر دی کہ ماں کو تشویش ہوگی، یعنی نماز پڑھتے ہوئے آپ علیہ السلام کو بچے کے رونے کی آواز کا احساس ہوا ہے؛ لیکن افسوس کہ لوگوں کے نزدیک حال شریعت ہے، اور سنت طبیعت ہے؛ حالاں کہ صحیح بات یہ ہے کہ اصل میں سنت شریعت ہے، اور حال طبیعت ہے۔ پس اعتبار سنت کا ہے نہ کہ طبیعت کا۔

نیز لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ طریقت اور بزرگی کا مطلب یہ ہے کہ بیوی بچوں کے ساتھ چاہے جو ہو جائے ہم خانقاہ میں چلہ کاٹیں گے، شیخ کے پاس جا کر چالیس دن گزاریں گے، اعتکاف ضرور کریں گے، ماہانہ مجلس میں لازماً جائیں گے، چاہے بیوی پیچھے مر جائے، یہ سنت طریقہ نہیں ہے۔ یا تو پیچھے کچھ انتظام کرنا چاہیے یا پھر نہیں جانا چاہیے؛ کیوں کہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی مریض کی تیمار داری میں ہو اور مریض کے ساتھ رہنے والا کوئی دوسرا آدمی ایسا نہیں ہے کہ آپ کو نماز کے لیے چھوڑ سکے اور اگر آپ اسی حالت میں نماز پڑھنے جائیں گے تو پیچھے مریض کو نقصان پہنچ سکتا ہے تو تیمار دار شخص کے لیے ترکِ جماعت کی اجازت ہے کہ آپ اپنی نماز تنہا پڑھ لیجیے اور مریض کی تیمار داری کیجیے۔ مسائل معلوم کر کے ان کے مطابق عمل کرنا چاہیے؛ ورنہ تو انسان کو پانی میں ڈوبتا ہوا چھوڑ کر لوگ تکبیر اولیٰ کا اہتمام کرتے ہیں، یاد رکھیں کہ تکبیرِ اولیٰ کا اہتمام کرنا نفل ہے، اور نماز پڑھنا فرض ہے، جب تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ نماز پڑھنا واجب نہیں ہے، تو بیوی بچوں کے حقوق تلف کر کے اللہ اللہ میں لگے رہنا، ذکر و شغل اور مراقبے میں لگنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

ایسی کئی مثالیں ہیں کہ اچھے اچھے دیندار، دعوت و تبلیغ سے وابستہ اور سالکین وغیرہ حضرات کے اسی نوع کے احوال کی وجہ سے خود گھر کے لوگ، دیگر رشتے دار و متعلقین دین سے بدظن ہوئے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ہر حال میں دین و شریعت کی، اور سنت کی صحیح تصویر پیش کریں۔

حاصلِ کلام

ہاں! اگر پہلا درجہ مکمل کر کے پھر دوسرے درجے پر جائیں تو بہت اچھی بات ہے، ماشاء

اللہ! نور علی نور! کہ فرض بھی پورا کیا اور نفل بھی پورا کیا؛ ورنہ اب کوئی آدمی عشاء کی نماز نہ پڑھے اور اس کے بعد تہجد پڑھنے لگ جائے، اور پوچھنے پر بتائے کہ نہیں! ابھی تہجد کے بعد عشاء پڑھ لوں گا، اور تہجد میں اتنی لمبی نماز پڑھے کہ فجر کی اذان ہونی شروع ہو جائے تو اس سے یہی کہا جائے گا کہ آپ نے غلط کیا، ایسا ہی ہے فرائض کو چھوڑ کر نوافل میں لگنا۔

الغرض ظاہر کو فرائض و واجبات سے آراستہ کرنا اور باطن کو سچے عقیدوں اور اچھی صفات سے سنوارنا یہ پہلا درجہ فرض عین ہے، اس کے حصول کے لیے خواہ کتابوں سے استفادہ کیا جائے یا علمائے کرام سے استفادہ کیا جائے، اور نفسانی و شیطانی رکاوٹوں کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھتے جائیں تو ان شاء اللہ منزلِ مقصود تک وصول اور رسائی آسان ہوگی۔ (جاری)

☆☆☆

سلوک کی ڈاک

ہدایۃ السالکین

محبتِ الٰہی و معرفتِ خداوندی کی راہ پر گامزن سالکین کرام موقع بہ موقع (ہفتہ واری اور ماہانہ اصلاحی و تربیتی مجالس نیز رمضان المبارک کے عشرہٗ اخیرہ کے اعتکاف مسنون میں) مختلف امور کے حوالے سے مرشدی حضرت مفتی سید احمد اللہ غوری صاحب نقشبندی مجددی دامت برکاتہم سے رہنمائی طلب کرتے رہتے ہیں۔ سوال و جواب کی یہ نشست، راہِ سلوک میں حضرت اقدس دامت برکاتہم کے پُرمعنیٰ و اہم تجربات کی روشنی میں قیمتی ہدایات و ارشادات پر مشتمل ہوتی ہے، اس لیے بھی سالکینِ طریقت کے درمیان کافی مقبول ہے۔ اب ماہنامہ میں مزید افادۂ عام کی غرض سے تحریری انداز میں قسط وار ''سوال و جواب'' پیش کئے جارہے ہیں۔ (مرتب: محمد عمران کورٹلوی)

سوال نمبر (۱) مراقبہ کی نیت میں ''میرے گناہوں کی ظلمت دور ہورہی ہے'' کہنا چاہیے یا ''میرے دل کی ظلمت دور ہورہی ہے'' کہنا چاہیے؟

جواب: مراقبہ کی نیت کے الفاظ یہ ہیں:

اللہ کی رحمت آرہی ہے میرے دل میں سما رہی ہے میرے دل سے گناہوں کی سیاہی اور ظلمت دور ہورہی ہے اور میرا دل کہہ رہا ہے اللہ اللہ اللہ۔

دل کی ظلمت دور ہورہی ہے نہیں بلکہ دل سے گناہوں کی سیاہی اور ظلمت دور ہورہی ہے، یہ نیت کرنی چاہیے۔

اصل میں دل فطرتاً منور ہے بس اس پر گناہ کی وجہ سے سیاہی چڑھ جاتی ہے جیسے کہ حجر اسود کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب جنت سے دنیا میں اتارا گیا تھا تو بالکل چمکدار اور سفید تھا؛ لیکن لوگوں کے گناہ اپنے اندر لیتے لیتے سیاہ ہوگیا۔

سوال نمبر (۲) مراقبہ کیسے کرنا چاہیے اور مراقبہ کے وقت ہماری کیا کیفیت ہونی چاہیے؟

جواب: **پہلی بات:** مراقبہ کا طریقہ یہ ہے کہ دن اور رات کے کسی بھی وقت جب آپ کو یکسوئی اور تنہائی میسر ہو اور کسی قسم کا خلل نہ ہو تو اس وقت آپ پرسکون انداز میں بیٹھ جائیں، سر کو جھکالیں آنکھوں کو بند کرلیں اور دل کی طرف متوجہ ہو جائیں پھر نیت کریں کہ اللہ کی رحمت آرہی ہے میرے دل میں سما رہی ہے میرے دل سے گناہوں کی ظلمت اور سیاہی دور ہورہی ہے اور میرا دل کہہ رہا ہے اللہ اللہ اللہ

بس دل ہی دل میں نیت کرنا ہے زبان سے کچھ کہنا نہیں ہے۔

ہاں! مراقبہ کرتے وقت جس قدر آداب کی رعایت کی جائے گی اتنا ہی زیادہ فائدہ ہوگا مثلاً باوضو مراقبہ کرنا، قبلہ رُخ ہوکر مراقبہ کرنا، دوزانو بیٹھ کر مراقبہ کرنا وغیرہ۔

دوسری بات: ہم کیفیات کے پیچھے نہ جائیں کیفیات مطلوب نہیں ہیں بلکہ اثرات مطلوب ہیں اس لیے اثرات دیکھنا چاہیے یعنی گناہوں سے بچنا نصیب ہورہا ہے یا نہیں اللہ کی یاد دل میں آرہی ہے یا نہیں اللہ کی محبت نصیب ہورہی ہے یا نہیں بے ادبی اور گستاخی اپنے اندر سے نکل رہی ہے یا نہیں اخلاق درست ہو رہے ہیں یا نہیں یہ اور اس جیسے اثرات مطلوب ہیں۔

سوال نمبر (۳) زیادہ عرصے تک معمولات نہ کرنے کی وجہ سے کیا دوبارہ بیعت کرنا اور نقش کروانا ضروری ہے؟

جواب: دوبارہ بیعت کرنے کی ضرورت تو نہیں ہے۔ ہاں! ایک بات یاد رکھیں کہ جو کلمات توبہ پڑھائے جاتے ہیں ان کو وقتاً فوقتاً حسب موقع انفرادی طور پر بھی دہراتے رہنا چاہیے چاہے معمولات پر عمل ہو یا نہ ہو۔

حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے کہ اپنے ایمان کو تازہ کیا کرو لا الہ الا اللہ کہہ کر اور کلماتِ توبہ میں سب سے پہلے لا الہ الا اللہ ہے۔ لہٰذا موقع بہ موقع دو تین دن کے وقفے سے ہی سہی کلمات توبہ از خود ہی دہراتے رہنا چاہیے۔ نشاندہی کے بارے میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ جب بھی شیخ کی خدمت میں حاضری ہو تو پہلی ہی ملاقات میں نشاندہی کروالینی چاہیے عموماً سالکین بلکہ قدیم سالکین بھی خدمت شیخ میں

حاضری کے موقع پر نشاندہی نہیں کرواتے ، اس کی وجہ یا تو بے خبری ہے یا پھر غفلت اور عام طور پر غفلت ہی ہوتی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ مشائخ عموماً خود سے نشاندہی نہیں کرتے بلکہ جو طلب دکھاتے ہیں انہی کو نقش کرتے ہیں۔نشاندہی کی وجہ سے لطائف میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے اور سلوک میں چلنا آسان ہوتا ہے۔ایسے ہی مجلس شیخ سے واپسی کے موقع پر بھی حسب موقع نشاندہی کروالینی چاہیے۔

سوال نمبر (۴) بیعت کے بعد اگر معمولات پر عمل نہ کر پائیں تو گناہ کے مرتکب ہوں گے اور سزا ہوگی ، اس خیال سے بیعت ہونے سے ڈر لگتا ہے؟

جواب : یہ خیال غلط ہے۔ ہاں بیعت ہونے کے بعد اگر معمولات پر عمل نہ ہو تو بیعت کے فوائد اور روحانی ترقی سے محروم رہیں گے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ بھی شیطان کی ایک چال ہے کہ وہ بیعت کے بعد آپ کو اپنی اصلاح و تربیت کروانے سے روکنے کے لیے اس قسم کے خیالات ذہن میں ڈالتا ہے تا کہ بندہ پیارے اللہ کی معرفت سے محروم رہے۔

سوال نمبر (۵) اللہ پاک کی سچی محبت کتنے اسباق طے کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے؟

جواب: آدمی اگر خلوصِ دل سے مراقبہ کرے اور مراقبہ میں آداب و ہدایات کی بھی پابندی کرے تو پہلے سبق پر بھی اللہ پاک کی محبت نصیب ہوسکتی ہے۔سبق بڑھنے کی نیت سے زیادہ مراقبہ نہیں کیا جاتا ، مراقبہ کی کثرت اس نیت سے ہونی چاہیے کہ ہمیں اللہ پاک کی سچی پکی محبت نصیب ہو جائے۔

سوال نمبر (۶): راہِ سلوک میں اسباق درجہ بہ درجہ کس طرح حاصل کیئے جاتے ہیں؟

جواب: سالک جس قدر لمبے لمبے مراقبے کرے اور پھر اسباق کے اثرات بھی اس پر مرتب ہوں ، اسی قدر اس کو اسباق کے اعتبار سے ترقی نصیب ہوگی۔ یہ کوئی کورس نہیں ہے کہ چند مہینوں یا چند سالوں میں مکمل کر لیا جائے یا کروا دیا جائے ؛ بلکہ کبھی کبھار سالہا سال تک سالک پہلے ہی سبق میں اٹکا ہوا رہتا ہے اور کوئی سالک ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدھ مہینے میں ہی اس کے لطائف کے اسباق مکمل ہو جاتے ہیں۔اسباق میں ترقی کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ گھنٹوں کے (لمبے لمبے) مراقبے کیئے جائیں اور گناہوں سے بچنے کا مکمل اہتمام ہو۔

سوال نمبر (۷): اللہ پاک کی نسبت کا نور تمام اسباق کے مکمل ہونے کے بعد ملتا ہے یا اس

سے پہلے بھی مل سکتا ہے؟

جواب: اللہ کی نسبت کا نور خالص اللہ تعالیٰ کا فضل اور ان کی ملک ہے؛ لہٰذا اللہ پاک کسی کو بھی دے سکتے ہیں اور کبھی بھی دے سکتے ہیں، اس کے لیے تمام اسباق کا مکمل ہونا شرط نہیں ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی کوئی سبق نہ کرے اور اللہ پاک اُس کو یوں ہی نورِ نسبت سے نوازدیں، کیوں کہ اللہ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ "اللہ کا فضل ہے اللہ جس کو چاہتے ہیں، عطا فرماتے ہیں۔" لیکن اللہ پاک کے یہاں ایک اصول ہے: اَللّٰهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ کہ جو اپنی طرف سے اللہ کو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ روتا دھوتا ہے، محنت کرتا ہے، مانگتا ہے، اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو یقیناً اللہ پاک نورِ نسبت کی نعمت سے سرفراز فرماتے ہیں۔

چناں چہ ہمارے مشائخ نے اسی تصوف کے راستے پر چل کر نسبت کا نور حاصل کیا ہے۔ اس لیے ہم بھی اس راستے کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جیسے علم کی نعمت ہے کہ اللہ پاک جس کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں؛ لیکن عام قاعدہ یہ ہے کہ اس کی تحصیل کے لئے مدرسے میں داخلہ لے کر پڑھنا ہوتا ہے، ایسے ہی راہِ سلوک کی محنت ہے کہ اس کے اصول وضوابط کے مطابق اپنے کو چلانے سے نورِ نسبت عطا ہوتا ہے۔

اسی لیے ہمارے حضرت جی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ نسبت کے نور کو تمنا بنا کر مانگنا چاہیے۔

ہاں ایک بات اور ہے اور وہ انتہائی اہم ہے۔ وہ یہ کہ نورِ نسبت کے حاصل ہونے میں گناہوں سے اجتناب کو بڑا دخل ہے۔ اس لیے ہر قسم کے گناہوں سے بچنا چاہیے۔

☆☆☆

اصلاحی وتربیتی منظوم کلام

پیامِ محبّت

از: حضرت سید منصور غوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ (دادا جان مدیر محترم)

عطا اس طرف بھی ہو نامِ محبّت
میں ہوں ساقیا تشنہ کامِ محبّت

ازل سے رہا ہوں غلامِ محبّت
ہے مسلک مرا احترامِ محبّت

محبت بھرا دل ہے پہلو میں میرے
میں دیتا ہوں سب کو پیامِ محبّت

محبت سے ملتا ہوں ملتا ہوں جس سے
میری ہر ادا ہے سلامِ محبّت

مناظر حسین رُوح پرور فضائیں
بڑا پُرکشش ہے مقامِ محبّت

محبّت جہاں ہے وہاں شَر کہاں ہے
پیامِ سکوں ہے پیامِ محبّت

نہ ہو جن میں ہمت وہ پہنچیں گے کیوں کر
فلک سے بھی اُونچا ہے بامِ محبّت

عطا کر محبّت کی لذّت سبھی کو
پلا اے خدا سب کو جامِ محبّت

کہا سن کے احباب نے اس غزل کو
یہ منصؔور کا ہے کلامِ محبّت

محبوب العلماء والصلحاء حضرت اقدس مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی قدس سرہ
کے سانحہ ارتحال پر قلب حزیں کی حالت زار بہ زبانِ حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب غوری رحمۃ اللہ علیہ

اس دلِ زار سے مفرِ عشق میں جیتے جی نہیں
رونا ہے مجھ کو عمر بھر، غم مرا عارضی نہیں

پیرِ مُغاں کا دم کہاں، اس کی وہ بزمِ جَم کہاں
بادہ نہیں تو ہم کہاں، زیست یہ زیست ہی نہیں

جائیں بچشمِ نم کہاں، روئیں اب اپنا غم کہاں
پہلے سے اب کرم کہاں، ایسا تو اب کوئی نہیں

لاکھ ہنسی کی بات ہو، لب پہ مگر ہنسی نہیں
غنچۂ دل بس اب مرا، بہرِ شگفتگی نہیں

کوئی مزا مزا نہیں، کوئی خوشی خوشی نہیں
ترے بغیر زندگی موت ہے، زندگی نہیں

(یکے از غلامانِ حضرت جی قدس سرہ)

مفتی احمد اللہ غوری نقشبندی مجدّدی